جلد ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء شمارہ ۵

ماہنامہ

میثاق

لاہور

★

زیر سرپرستی

مولانا امین احسن اصلاحی

★

مدیر مسئول

اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

دار الاشاعت الاسلامیہ

بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر، لاہور-۱

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے

سالانہ: چھ روپے (پندرہ شلنگ)

(مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک چودہ روپے)

آپ کے خطوط سے

★

''..... میں نے آپ کی کتاب ، آتے ہی پڑھ ڈالی ۔ میرے لئے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس شخص کے ذہن و فکر پر کوئی دوسرے اثرات نہیں تھے، جس کا تمام دینی شعور جماعت اسلامی کی گود ہی میں پلا بڑھا اور تمام تربیت اسی کے سانچے میں ہوئی ، اس کا ذہن اس قابل ہوا کیسے کہ جماعت کی پالیسی سے اتنی جلد بے اطمینانی محسوس کرنے لگے! میرے خیال میں شاید اس کی کوئی دوسری مثال جماعت میں نہیں ہے اور آپ کی یہی خصوصیت اس کتاب کی سب سے بڑی اپیل ہے ۔''

(مولانا) عتیق الرحمان سنبھلی
مدیر ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ

★

''..... ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں نے بھی پڑھی ، میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ بعد میں سامنے آیا اس کی پوری بنیاد آغاز ہی میں موجود تھی لیکن ہم اس کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھتے اور ڈھالتے تھے، اسلام کی سر بلندی کا نصب العین زیادہ چھان پھٹک اور کھود کرید کرنے نہیں دیتا تھا ۔ اس کے باوجود کتاب بہت خوب ہے اور ۸۔۱۰ سال تک اس کو روکے رکھنے کا ان کا عمل تو بہت ہی قابل داد اور لائق سبق آموزی ہے ۔

(مولانا) محمد منظور نعمانی
مدیر مسئول ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ

★

''جناب غازی عبدالجبار صاحب کی وساطت سے 'میثاق' شمارہ نمبر ۲ (جلد ۱۲) نظر سے گزرا اور ''تحریک جماعت اسلامی'' پر نوائے وقت کے صفحات میں تبصرہ بھی پڑھا ۔

میں جماعت اسلامی کی تحریک میں اس کے آغاز ہی سے دلچسپی لیتا رہا ہوں بلکہ مجھے تو چوہدری نیاز علی صاحب نے سرنا کے قریب جو دارالاسلام بنایا اس میں آ کر رہنے اور شاہنامہ اسلام کی تکمیل کرنے کی دعوت بھی دی تھی جس کو میں بوجوہ قبول نہ کر سکا درآنحالیکہ میرا ننھیال دینا نگر بھی قریب ہی تھا ۔ اور جماعت اسلامی کی تشکیل پنجاب میں میرے ننھیال کے قریب ہی ہوئی ۔ لہذا میں نے مولانا مودودی کی تحریریں شوق سے پڑھیں ۔ لیکن افسوس کہ میں نے اکثر مقامات پر تحریروں اور اعمال اور کہنے اور کرنے میں بہت تضاد پایا ۔

مجھے غازی صاحب سے یہ معلوم کر کے بہت ہی خوشی ہوئی کہ آپ میری طرح یا غازی صاحب کی مانند عمر رسیدہ اور کمر خمیدہ آدمی نہیں ہیں ——————— اگر آپ سے ملاقات ہوئی تو شاید ہم ایک ہی کشتی میں نظر آنے لگیں یا ایک شرف ہمنوائی مجھے بھی حاصل ہو جائے ۔''

ابوالاثر حفیظ جالندھری
ہلال امتیاز
سٹلائٹ ٹاؤن ۔ راولپنڈی

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ

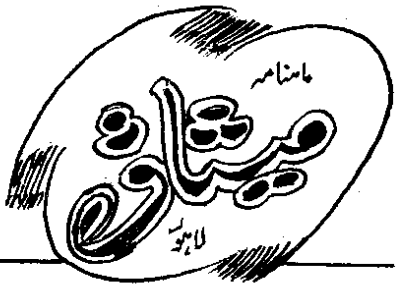

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد (۱۲) شمارہ (۵)

بابت
نومبر ۱۹۶۶ء
مطابق
رجب المرجب ۱۳۸۶ء

فہرست

تذکرہ وتبصرہ ——— اسرار احمد

نجات کی راہ سورۂ والعصر کی روشنی میں ۲

تدبر قرآن ——— مولانا امین احسن اصلاحی

مقدمہ — (۲) ۱۹

تفسیر سورۂ آل عمران — (۱۱) ۲۳

مقالات ——— خالد مسعود

زکوٰۃ کی حقیقت — (۴) ۳۷

"تحریک جماعت اسلامی" — (۲) ——— اسرار احمد

نقضِ غزل — (۳) ۴۳

افکار و آراء ——— سردار محمد اجمل خاں لغاری - سالم جان صاحب

جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں کی خدمت میں ۵۵

علماء کرام کی خدمت میں ۵۶

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس شمارے کیساتھ آپ کا زرمبادلہ ختم ہورہا ہے۔ آئندہ کے لئے :-

- سالانہ زرمبادلہ مبلغ چھ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں۔
- اگر آپ کسی وجہ سے سالانہ خریداری جاری رکھنا نہ چاہیں تو ہمیں مطلع فرمادیں ۔ ورنہ
- آئندہ شمارہ آپ کو سالانہ زرمبادلہ اور محصول ڈاک کی مالیت کا وی۔ پی ارسال ہوگا اور اس کو وصول کرنے کے آپ اخلاقاً ذمہ دار ہوں گے۔

جملہ خط کتابت ترسیل زر کا پتہ } دارالاشاعت الاسلامیہ بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر لاہور

محی الدین پبلشر نے باہتمام محمد طفیل مالک نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر دارالاشاعت الاسلامیہ بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر لاہور سے شائع کیا۔

تذکرہ و تبصرہ

اسرار احمد

نجات کی راہ

سورۂ والعصر کی روشنی میں

(۱)

سورۂ والعصر قرآن حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے اور خوش قسمتی سے اس میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ سب کے سب اردو میں عام طور پر مستعمل ہیں اور ایک عام اردو داں ان سے بہت حد تک مانوس ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سورت کا سرسری مفہوم تقریباً ہر شخص فوراً جان لیتا ہے اور اس میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اگر غور و فکر سے کام لیا جائے اور اس کے مضامین کی گہرائیوں کا بدقت نظر مشاہدہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورہ "سہلِ ممتنع" کی کیسی عظیم الشان مثال ہے اور اس کی ظاہری سادگی اور سلاست کے پردوں میں علم و حکمت کے کتنے قیمتی خزانے پوشیدہ ہیں ——— واقعہ یہ ہے کہ عقائد و ایمانیات کے بیان میں اختصار کی انتہا کے باوصف مفہوم کی وسعت اور معانی کے عمق کے اعتبار سے جو مقام سورۂ اخلاص کا ہے ——— وہی مقام نجات اور فوز و فلاح کے عملی نہج اور طریق کار کے بیان میں اس سورہ کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس کو "جوامع الکلم" میں شمار کیا ہے ——— اور امام شافعیؒ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ ——— "اگر لوگ تنہا اسی سورہ پر غور کریں تو یہ ان کے لئے کافی ہو جائے!"

یہ سورہ کل تین آیات پر مشتمل ہے۔ اور اس کی دوسری آیت عددی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ مفہوم کے لحاظ سے بھی مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں یہ دردناک حقیقت بطورِ کلیہ بیان ہوئی ہے کہ "انسان بالعموم اور بحیثیت مجموعی خسارے میں ہے"۔ پہلی آیت میں اس حقیقتِ کبریٰ کے

دلائل و شواہد کو صرف ایک قسم میں سمو کر پیش کر دیا گیا ہے ——— جبکہ تیسری آیت اُس کلیے سے ایک استثناء کو بیان کر رہی ہے۔ اس طرح یہ سورۃ واضح طور پر دو حصّوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ اس کا پہلا جزو یعنی " وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ ایک دعویٰ اور اس کی دلیل پر مشتمل ہونے کی بنا پر انتہائی گہری علمی اہمیت کا حامل ہے ——— جبکہ دوسرا جزو یعنی اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝" عملی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ اس حصّے میں ضمنی طور پر ایک کامیاب زندگی کے ناگزیر عملی لوازم کی تشریح ہو گئی ہے۔ اور اس طرح یہ حصّہ "صراط مستقیم" اور "سواء السبیل" کی مختصر ترین لیکن جامع و مانع تفسیر بن گیا ہے۔

سطور ذیل میں اس سورہ کی تفسیر لکھنا مقصود نہیں ہے اس لئے بھی کہ راقم الحروف کا مقام یہ نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ اس کے نزدیک اس سورہ کی تفسیر کا حق مولانا حمید الدین فراہیؒ نے ادا کر دیا ہے۔

پیشِ نظر تحریر سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس سورہ کے بعض مجموعی تاثرات اور خاص طور پر اس کے جزو ثانی کے بعض مضمرات کو واضح کیا جائے تاکہ دین کے تقاضوں کا ایک مجمل مگر جامع تصور سامنے آجائے۔

(۲)

بحیثیت مجموعی اس سورہ پر انذار کا رنگ غالب ہے۔ تبشیر کا پہلو بھی اگرچہ موجود ہے لیکن خفی اور ضمنی طور پر۔

اوّلاً اس کی ابتداء انتہائی چونکا دینے والی ہے " وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ کے الفاظ صرف اپنے مفہوم کے اعتبار ہی سے خواب غفلت سے بیدار کر دینے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے انداز اور اسلوب حتیٰ کہ ان کے صوتی اثرات تک میں جھنجھوڑنے اور چونکانے کی صلاحیت موجود ہے۔

ثانیاً یہاں اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ بطور ایک قاعدہ کلیہ کے بیان ہوا ہے اور اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا.... الآیہ میں ایک استثناء پیش کیا گیا ہے۔

گویا انسان کا خسران ایک عالمگیر حقیقت ہے اور فلاح و کامیابی محض ایک استثنائی صورت!

اگرچہ بعینہٖ یہی صورت حال سورۃ والتین میں بھی پیش فرمائی گئی کہ "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ" میں نوعِ انسانی کی مجموعی اور عمومی حالت بیان کی گئی اور "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" میں مستثنیٰ افراد کا تذکرہ کیا گیا ـــــ لیکن وہاں دو چیزوں نے انذار پر تبشیر اور بیم پر رجا کے پہلو کو غالب کر دیا ہے۔ ایک "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ" سے متصلاً قبل "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" کی یقین دہانی میں پوشیدہ تسلی اور تشفی نے۔ اور دوسرے "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے فوراً بعد "فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" کی نوید جانفزا نے جو فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کی مثبت ضمانت ہے۔ سورہ والعصر میں نہ صرف یہ کہ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" کی قسم کی کوئی تسلی و تشفی (RE-ASSURANCE) موجود نہیں بلکہ "اجر غیر ممنون" کے مثبت وعدے کی بجائے بات صرف خسران سے نجات کے تذکرے پر ختم ہو گئی ہے

سورۃ والتین کے مقابلے میں سورۃ والعصر پر انذار کے رنگ کے غلبے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کہ سورہ والتین میں گراوٹ سے استثنار کے تذکرے میں ایمان کے ساتھ اس کے لوازم میں سے صرف عمل صالح کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا ہے ـــــ وہاں سورہ والعصر میں خسران سے بچاؤ کو عمل صالح کے ساتھ ساتھ ایمان کے زیادہ کٹھن اور ثقیل لوازم یعنی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے بھی مشروط کر دیا گیا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک قول سورۃ والتین اور سورۃ والعصر کے مضامین کے مابین ایک لطیف فرق کو واضح کرنے میں بہت ممد ہے۔ پہاڑی کے وعظ میں آنجناب ارشاد فرماتے ہیں۔

"تنگ دروازے سے داخل ہو کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے اور اس سے داخل ہونے والے بہت ہیں ۔ کیونکہ وہ دروازہ تنگ ہے اور وہ راستہ سکڑا ہے جو زندگی کو پہنچاتا ہے اور اس کے پانے والے تھوڑے ہیں" (۷: ۱۳، ۱۴)

اگرچہ سورۃ والتین اور سورۃ والعصر دونوں میں حضرت مسیح کے بیان کردہ دونوں راستوں کا تذکرہ موجود ہے لیکن سورۃ والعصر کی روشنی کا اصل ارتکاز اس چوڑی اور کشادہ شاہراہ پر ہے جس پر انسانوں کا ایک عظیم ہجوم، غول در غول، صرف بطن اور فرج کی پوجا کرتے ہوئے اور محض جبلی خواہشات کی بندگی کرتے ہوئے کچھ فرسودہ روایات کے سہارے اور زیادہ تر بھیڑ چال کے انداز میں رواں دواں ہے اور لحظہ بلحظہ ابدی خسران کے دردناک انجام سے قریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس سورۃ والتین

کا نور بنیادی طور پر اس دوسری راہ پر مرتکز ہے جو اگرچہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے بہت کم ہیں لیکن بالآخر وہ فراخی اور ابدی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ ایک حساس اور باشعور انسان جس کے اندر کا نور بیدار ہو چکا ہو، جب سورہ والعصر کی روشنی میں نوع انسانی کی عظیم اکثریت کی مایوس کن حالت اور ان کے انجام کی تلخی کا مشاہدہ کریگا تو لازماً اس پر مایوسی اور ناامیدی طاری ہوگی اور عین ممکن ہے کہ وہ انسان کی فطرت اور سرشت ہی سے بدگمان ہو جائے۔ اس ذہنی و نفسیاتی تاریکی کے عالم میں سورۂ والتین امید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوتی ہے۔ اس کی روشنی میں صراطِ مستقیم پر گامزن چند نفوس قدسیہ کی ایک جھلک اور انسانی فطرت و سرشت کی شرافت و کرامت کی شہادت سے یاس کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور انسان اپنے مستقبل کے بارے میں امید اور خود اپنے آپ پر ایک گونہ اعتماد محسوس کرنے لگتا ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" کی عالمگیر حقیقت پر شہادت بھی آفاق گیر پیش فرمائی گئی اس لئے کہ جتنی جلی وہ حقیقت ہے اسی قدر روشن اس کی دلیل ہے۔ لیکن لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کی اٹل مگر خفی حقیقت پر شہادت میں زیادہ سے زیادہ ان نفوس قدسیہ کو پیش کیا جا سکا جو کبھی "تین و زیتون" کے جھنڈوں تلے چلتے پھرتے دیکھے گئے یا "طورِ سینین" کی بلندیوں پر رب الارباب سے ہم کلام پائے گئے یا "بلدالامین" میں انسانی عظمت کی شہادت دیتے ہوئے نظر آئے۔

(۳)

"والعصر" کی چونکا دینے والی صدا ایک حساس اور باشعور انسان کے ذہن کو فوری طور پر اپنے قریبی ماحول میں گم شدگی اور ذاتی مسائل و معاملات میں سرگردانی کی حالت سے نکال کر زمان و مکان کی وسعتوں کی جانب متوجہ کر دیتی ہے ــــ گویا "والعصر" کا اولین مفاد یہ ہے کہ انسان "آفاق میں گم" ہونے کی حالت سے نکل کر آفاق اور اس کی وسعتوں کا شعوری (SUBJECTIVE) مشاہدہ کرے ع

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!

واقعہ یہ ہے کہ انسان کی ذہنی پستی کا سب سے بڑا مظہر یہی ہے کہ وہ اپنے قریب ترین ماحول اور ذاتی حالات و واقعات میں الجھ کر رہ جائے۔ اس حال میں انسان کی کل کائنات بس ان ہی دو چیزوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

نہ وہ خود اپنی ہستی کی اندرونی و باطنی شہادتوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور نہ خارج کی وسیع تر آفاقی آیات کی طرف التفات کرتا ہے۔

اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل اسے پہاڑ معلوم ہونے لگتے ہیں اور حقیر سی خواہشوں اور تمناؤں کے پیچھے وہ اپنے آپ کو ہلکان کر لیتا ہے۔

اس ذہنی و نفسیاتی حبس سے نکلنے کی دو راہیں قرآن حکیم نے بیان فرمائی ہیں ایک خود اپنے من میں ڈوب کر" حقیقت الحقائق تک رسائی کی راہ، اور دوسرے آیاتِ آفاقی پر غور و فکر اور دھر و عصر کی اظہر من الشمس شہادتوں پر تدبر و تفکر کا راستہ۔

سورۂ والعصر اسی موخر الذکر راستے کی جانب رہنمائی کرتی ہے!

عصر کی جانب ادنیٰ تامل و التفات سے فوری طور پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ زمانہ جو انسان کو اپنی غفلت میں ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، حقیقتاً بڑی تیزی اور انتہائی سرعت سے گزرا چلا جا رہا ہے۔ اس کی ایک دو کروٹوں کی ہی دیر ہے کہ جو کچھ آج موجود ہے وہ معدوم ہو جائے گا اور وقت کی بساط پر نئے کھلاڑی کھیل رچائیں گے۔ اس کی تیز روی اور برق رفتاری بانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ اے غافل انسانو! تم، تمہارے مسائل اور تمہارے معاملات سب چشم زدن میں ختم ہو جانے والے ہیں۔ عمر کی مہلت تیزی سے ختم ہو رہی ہے اور متاعِ زیست بڑی سرعت سے برف کی مانند پگھلی جا رہی ہے اور کوئی دیر کی بات ہے کہ تم قصۂ ماضی بن جاؤ گے ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی!
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

پھر یہی زمانہ ـــ جسے فلکِ پیر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، انسان کا سب سے بڑا واعظ و ناصح بھی ہے۔ اس کی گردشوں میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانوں کی شکل میں عبرت اور نصیحت و موعظت کے ضخیم دفاتر محفوظ ہیں، اس نے سینکڑوں قوموں کو ابھرتے ـــ قوت پکڑتے اور پھر قعرِ مذلت میں گرتے دیکھا۔ ہزاروں حکومتیں اس کے سامنے بنیں اور بگڑیں، بیسیوں تہذیبیں وجود میں آئیں، عروج کو پہنچیں اور پھر گل سڑ کر متعفن غلاظت کا ڈھیر بن گئیں۔ اربوں کھربوں انسان پیدا ہوتے، پلے بڑھے اور مٹی میں مل گئے، کتنوں نے فتح و ظفرمندی کے کھیل کھیلے اور کتنوں نے سروری اور ظلِ الٰہی کے سوانگ رچائے ـــ لیکن بالآخر سب زمانے کی وسعتوں

میں گم ہو گئے اور

قس بن ساعدہ جیسے لوگ بھی یہ کہتے رہ گئے کہ این الآباء والاجداد و
این المریض والعواد واین الفراعنۃ الشداد واین من بنیٰ
و شیّد وزخرف ونجد وغرّۃ المال الولد واین من
بغی وطغیٰ وجمع فاوعیٰ وقال انا ربکم الاعلیٰ[1]

قرآنِ حکیم نے یہاں صرف والعصر کے ایک لفظ میں جن تاریخی حقائق کی جانب اشارہ کیا ہے وہ جب تفصیل سے بیان ہوئے تو علوم قرآنی کی ایک مستقل صنف بن گئے — جسے شاہ ولی اللہؒ نے تذکیر بایّام اللہ کا نام دیا۔

(۴)

ان الانسان لفی خسر ایک ایسی دردناک مگر ناقابلِ انکار حقیقت کا بیان ہے جس کے ادنیٰ مظاہر اسی دنیا میں چاروں طرف پھیلے نظر آتے ہیں لیکن جس کی اصل تلخی موت کے بعد ظاہر ہونے والی ہے۔

غنیمت ہے کہ یہاں دلِ درد مند اور قلبِ حسّاس شاذ ہی کسی کو عطا ہوا ورنہ
ایک نہیں لاکھوں گوتم بدھ ان شدائد و مصائب کا مشاہدہ کر کے جن سے ابنائے
نوع بر آں دو چار ہیں اپنے آرام و آسائش کو تج کر جنگلوں میں جا دھونی رماتے

ذرا آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ کرۂ ارض پر کروڑہا انسانوں کو دن بھر کی کمر توڑ دینے والی محنت و مشقت کے باوجود پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ کتنے ہی ہیں جن کے سامنے ان کے عزیز و اقارب اور محبوب و محب دوا کے ایک گھونٹ کو ترستے دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنوں کو تن ڈھانکنا نصیب نہیں اور کتنوں کے پاس سر چھپانے کو جگہ موجود نہیں! کیسے کیسے صدمے یہ انسان برداشت کرتا ہے اور کیسے کیسے دکھ اس کی جان کے لاگو بنتے ہیں کبھی اولاد کی محبت اسے رلاتی ہے تو کبھی مال کی محبت اسے تڑپاتی ہے۔ کبھی ناکام آرزوئیں اس کے گلے

---

[1] ترجمہ:- کہاں ہیں آباؤ اجداد! کہاں ہیں مریض اور ان کے عیادت کرنے والے؛ کہاں ہیں فراعنہ اور شداد اور وہ لوگ جنہوں نے فلک بوس عمارتیں بنوائیں، جنہوں نے آراستہ کیا اور سنوارا اور مال و اولاد کی محبت نے ان کو دھوکے میں رکھا۔ کہاں ہیں وہ جنہوں نے سرکشی کی اور اکڑے اور سمیٹا اور کہا - انا ربکم الاعلیٰ!

کا ہار ہو جاتی ہیں تو کبھی پامال شدہ جذبات اس کے لئے سوہانِ روح بن جاتے ہیں ـــــ ارباب نعمت کی بظاہر چمکیلی اور بھڑکیلی زندگی پر نہ جانا چاہیئے۔ ان بے چاروں کے اپنے دکھ ہیں۔ عوام کے دکھوں سے کہیں زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ! خوب سے خوب تر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی تلاش میں یہ دن رات مارے مارے پھرتے ہیں، اور اس دوڑ دھوپ میں جن مایوسیوں (FRUSTRATIONS) کا سامنا انہیں ہوتا ہے اور متضاد خواہشات کی رسہ کشی سے جو الجھنیں (CONFLICTS) انہیں درپیش ہوتی ہیں، وہی جانتے ہیں کہ ان کی بدولت کیسے کیسے الاؤ ان کے سینوں میں گرم ہوتے ہیں اور کیسے دہکتے ہوئے انگارے ان کے دل و جگر کو کباب کرتے ہیں، آرام و آسائش کے سارے ساز و سامان رکھتے ہوئے انہیں نہ دن کا چین نصیب ہوتا ہے نہ رات کی نیند ـــــ یہ سب کیا ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ"[۴] کی عملی تفسیر ـــــ خسرانِ انسانی کی ابتدائی منزل!! ـــــ اور انسانی المیے کا صرف پہلا مرحلہ ـــــ!!!

اس مرحلے میں انسان کی حالت اکثر و بیشتر صرف اتنی ہی قابلِ رحم ہے جتنی کولہو کے کسی بیل یا بار برداری کے کسی جانور کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بزعمِ خویش حیوانوں کے مقابلے میں انسان جسمانی تکلیف سے بڑھ کر نفسیاتی کرب اور روحانی اذیت کو بھی محسوس کرتا ہے ـــــ لیکن اس کی ٹریجڈی کا اصل نقطۂ عروج (Climax) وہ ہوگا جب یہ مشقتیں اٹھاتا، مصیبتیں جھیلتا ـــــ تکلیفیں برداشت کرتا اور صدمے سہتا اچانک اپنے پروردگار کے حضور میں محاسبے اور سوال جواب کے لیے پیش کر دیا جائے گا ـــــ یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ[۵]۔ تب انسان پکار اٹھے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا ـــــ! اس مرحلے کے تصور سے نسلِ انسانی کے گل سرسبد کانپ کانپ جاتے ہیں اور حسرت سے پکار اُٹھتے ہیں: کاش میں درختوں پر چہچہاتی چڑیا ہوتا یا سوکھی گھاس کا ایک تنکا!۔

اس وقت "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" کی اصل حقیقت منکشف ہوگی اور انسانوں کی عظیم اکثریت تاسف و حسرت کے ساتھ زبانِ حال سے پکارے گی کہ ع

مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے!

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ۝

---

[۴] سورۂ بلد آیت ۴: حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو محنت اور مشقت میں پیدا کیا۔

[۵] انشقاق آیت ۶: اے انسان! تو تکلیفیں اور مشقتیں اٹھاتا بالآخر اپنے رب سے جا ملے گا۔

(۵)

"اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝" انسان کی کامیابی کی واحد راہِ کامیابی ہے، لہٰذا ناگزیر ہے کہ اس آیۂ کریمہ پر مقدور بھر غور و فکر کیا جائے اور اس کے مضمرات اور مقدّرات کو حتی الامکان پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ سے ناقابلِ انقطاع تعلق کی بنا پر اس آیت پر اوّلین تدبر آیۂ ماسبق کے پس منظر ہی میں کیا جانا چاہیئے۔ یہ دونوں آیتیں فوری طور پر جس حقیقت کو واضح کرتی ہیں وہ یہ ہے، کہ زندگی کی ہر وہ ہیچ جو ایمان، عملِ صالح۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے خالی ہو خالص زیاں کاری ہے چاہے بظاہر دنیا کے مروّجہ معیارات کے اعتبار سے کتنی ہی شاندار کامیابیوں کی چمک دمک لگا ہوں کو خیرہ کئے دیتی ہو۔ یہ آیات انسان کی کامیابی و ناکامی اور نفع و نقصان کا ایک بالکل نیا معیار پیش کرتی ہیں اور ان کے انسانی ذہن و شعور میں مرتسم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ زندگی کی تمام اقدار بدل جائیں اور زندگی کی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کے ماحصل کے بارے میں انسان کا نقطۂ نظر کاملۃً تبدیل ہو جائے

حتیٰ کہ سیاسی قوت ہو یا معاشرتی حیثیت، مال و دولت کی فراوانی ہو یا وسائل و اسباب کی ارزانی، اونچی اونچی ملازمتیں ہوں یا مستحکم کاروبار، لمبی اور چمکیلی کاریں ہوں یا وسیع و خوشنما محلات ـــــ یہ سب اگر ان چار چیزوں کے بغیر ہوں تو نہ صرف یہ کہ محض سراب نظر آئیں بلکہ عذاب کے مقدّمات معلوم ہوں۔!!

واقعہ یہ ہے کہ انسان کی کامیابی ـــــ اور ابدی خسران سے نجات کے لئے سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اس کے نقطۂ نظر میں یہ انقلاب بالفعل واقع ہو جائے اور یہ حقیقت دل و دماغ میں اس طرح پیوست ہو جائے کہ ہر چیز کی ماہیت واقعۃً بدلی ہوئی نظر آنے لگے ع

دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز!!

دوسری انتہائی اہم حقیقت جو ان دونوں آیات کے باہمی ربط و تعلق سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ چار چیزیں نجات کے ناگزیر لوازم اور فلاحِ انسانی کی کم از کم شرائط ہیں۔ اس لئے بھی کہ یہاں مقاماتِ بلند کا تذکرہ نہیں بلکہ خسارے اور نقصان سے نجات کی بات ہو رہی ہے اور اس لئے بھی کہ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں جس میں بہت کچھ کبھی "محض زیبِ داستاں کے لئے" اور کبھی صرف قافیے اور ردیف کی ضرورتوں کے تحت بڑھا لیا جاتا ہے ـــــ بلکہ کلامِ الٰہی ہے جس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ علم و حکمت کا سرچشمہ ـــــ اور حقائق و معارف کا گنجینہ ہے ـــــ یہاں جو کچھ ہے "حق" ہے، اور

اس میں ترکمی کی گنجائش ہے نہ بیشی کا امکان! کامیابی کی ان چار لازمی شرائط میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے تو قرآن حکیم کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے ـــــ اور اس کے بعد اپنے آپ کو کلامِ الٰہی کی بشارتوں کا مستحق سمجھنا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

بدقسمتی سے ہمارے دورِ انحطاط میں یہ حقیقت نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے ـــــ ہماری ایک عظیم اکثریت محض ایمان ـــــ اور اس کے بھی صرف قانونی پہلو پر ـــــ نجات کی صد فی صد امیدوار بنی بیٹھی ہے ـــــ جن کو ذرا زیادہ فہم و شعور عطا ہوا ہے وہ عملِ صالح کی قید لگا لیتے ہیں ـــــ لیکن اہلِ علم کی بھی ایک بڑی تعداد تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو اعلیٰ درجات اور بلند مرتبے کی چیزیں سمجھ کر اضافی نیکیاں شمار کر بیٹھے ہیں!

کاش کہ لوگ سورۂ والعصر پر تدبر کریں ـــــ اور اس حقیقت کو جان لیں کہ قرآن حکیم انسانی نجات کو ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر چاروں سے مشروط قرار دے رہا ہے!!!

ـــــ (۶) ـــــ

ایک قدم آگے بڑھائیے اور توجہ کو ان چاروں الفاظ پر مرکوز کر کے ان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ چار مختلف چیزیں یا کسی ایک نسخے کے چار علیحدہ علیحدہ اجزا نہیں ـــــ بلکہ نجات کی راہ کے چار نشانات اور ایک ہی "صراطِ مستقیم" کے چار سنگھائے میل ہیں! یہ چاروں ایک جانب نجات کے لوازم ہیں اور دوسری جانب باہم دگر لازم و ملزوم!

ایمان، عملِ صالح کا پیش خیمہ ہے ـــــ عملِ صالح، تواصی بالحق کا مقدمہ ـــــ اور تواصی بالحق، تواصی بالصبر کا پیش رَو! ایمان صحیح ہوگا تو عملِ صالح لازماً پیدا ہوگا ـــــ عملِ صالح لازماً تواصی بالحق کو جنم دے گا اور ـــــ تواصی بالحق لازماً تواصی بالصبر پر منتج ہوگا ـــــ!!

ایمان کے سیاسی اور عمرانی پہلوؤں ـــــ اور اس مسئلے سے متعلق فقہی و کلامی بحثوں سے قطع نظر ایمان کی اصل حقیقت اور ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان نفسِ انسانی کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے جو کائنات کے بنیادی حقائق یعنی توحید، معاد اور رسالت کے علم سے پیدا ہوتی ہے اور قلبِ انسانی پر اس طور سے مستولی ہو جاتی ہے کہ انسان کے جذبات، خواہشات اور ارادے باہم توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ اس علم کے تابع ہو جاتے ہیں! اور فی الجملہ علم اور ارادے کے مابین

دوئی ختم ہو کر یگانگت پیدا ہو جاتی ہے! ـــــ

علمِ حقیقی کے ساتھ انسانی ارادے کی مکمل یگانگت اور ہم آہنگی ہی ایمان کی اصل روح ہے ـــــ اور اس سے پیدا شدہ سکون اور اطمینان ایمان کا اصل ماحصل!!

رہی علم کی وہ حالت کہ ؎ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

تو جب تک یہ کیفیت برقرار رہے اور نفسِ انسانی تضادات (CONFLICTS) کی آماجگاہ بنا رہے اس وقت تک ایمانِ حقیقی سے انسان محروم رہتا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے الفاظ میں

"خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایمان ایک نفسانی و روحانی حالت کا نام ہے جو انسان کے تمام عقائد و اعمال پر حاوی ہے .... اس کے دو رکن ہیں ایک علم اور دوسرا عمل ان میں سے ایک کو بھی ڈھا دو گے اس کی پوری عمارت ڈھ جائے گی، ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دین کے تمام اصول و فروع سے خوب واقف ہے لیکن نافرمانی اور گناہ پر برابر مصر ہے تو اس کیلئے اس ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے۔"

ظاہر ہے کہ جب ایمان کی حقیقت یہ ہے تو عمل صالح تو خود اس کی ایک فرع ہے اور اس کا ایک لازمی نتیجہ! یہاں تک کہ عمل صالح کے فقدان اور ایمان کے عملی نتائج کے عدمِ ظہور سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایمان ہی میں خامی ہے اور صورتِ حال وہ ہے کہ " وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ " ورنہ ایمان و عمل صالح کا تو ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ان کا ایک دوسرے کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ـــــ اور ان دونوں کو ایک شمار کرنا خلافِ واقعہ نہیں ہے!

"عمل صالح" کی قرآنی اصطلاح بھی بہت غور و فکر کی مستحق ہے، ایک طرف تو قرآن حکیم اس وسیع اصطلاح میں اپنی ساری قانونی و اخلاقی تعلیمات اور پوری شریعت کو سمیٹ لیتا ہے اور دوسری طرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسی میں انسان کی حقیقی نشو و نما اور ترقی کا راز مضمر ہے اور اسی کے ذریعے انسان کی تمام فطری صلاحیتوں اور قوتوں (POTENTIALITIES) کا صحیح رُخ پر ارتقاء ممکن ہے، مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں:

"اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو "صالحات" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لفظ کے استعمال سے

اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیاوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمال حسنہ ہی ہیں یعنی عمل صالح وہ عمل ہوا جو انسان کے لئے زندگی اور نشو ونما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعے سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں .... اس نکتے کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی اس مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال میں سے صالح اعمال صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس کلی نظام کے لئے پسند فرمائی ہے !!"

گویا ایمان نام ہے انسان کے خیالات و تصورات اور خواہشات وجذبات کے علم حقیقی کیساتھ ہم آہنگ ہونے کا اور عمل صالح نام ہے اعمال انسانی کی اس مشیئت کلی کے ساتھ موافقت کا جو اس کائنات میں جاری وساری ہے۔ اور یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ ایمان اور عمل صالح کا تذکرہ ایک ساتھ کرتا ہے اور ایسے مقامات اول تو ہیں ہی بہت کم جہاں صرف ایمان کا ذکر کیا گیا ہو اور جہاں ایسا ہوا ہے وہاں بھی اکثر و بیشتر کوئی قرینہ ایسا ضرور موجود ہوتا ہے جس سے ایمان کے عملی تقاضوں کی جانب ازخود اشارہ ہو جائے

مزید غور فرمائیے کہ انسان ایک متمدن حیوان ہے اور کوئی چاہے یا نہ چاہے اپنے اردگرد کے ماحول سے اس کا فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کا تعلق بالفعل موجود ہے۔ اولاً خود اس کے اعمال اگر واقعی صالح ہوں تو ان کے صالح اثرات اس کے خارج پر لازماً مترتب ہوں گے اور بالکل اس طرح جس طرح ایک دھکتے ہوئے انگارے سے گرمی خارج ہوتی ہے اور اپنے ماحول کو گرما دیتی ہے اور برف کی خنکی اپنے ماحول میں نفوذ کرتی ہے انسانی اعمال کا صلاح و فساد ماحول کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا — ثانیاً ماحول میں اگر فساد موجود ہو تو لازماً ایک صالح انسان کو اس کے مفسد اثرات سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے مدافعت کرنی ہوگی .... ان ہی دو چیزوں کی بنیاد پر ایمان اور عمل صالح سے لازماً تواصی بالحق اور تواصی بالصبر پیدا ہوتے ہیں اور بالکل جیسے ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم دگر لازم وملزوم ہیں۔

مولانا فراہیؒ عمل صالح سے تواصی کے تعلق کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں :-

"اس سے معلوم ہوا کہ جسطرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوا اسی طرح عمل صالح سے تواصی وجود میں آیا کیونکہ جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کے لئے صبر و استقامت

کی تمام کڑیاں بھی سہنے پر آمادہ ہوگا، اس کے بارہ میں لازماً اس کا علم، اس کی محبت اور اس کی عزت ہر چیز بڑھ جائے گی اور اب صرف اسی قدر نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ تمام دنیا اس سے عشق کرے اور جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھے گا تڑپ اٹھیگا اور ایک غیور اور شریف انسان کی طرح دوسروں کو بھی ابھارے گا کہ حق کی حمایت کے لیے آمادہ ہوں اور اس کا یہ دوسروں کو ابھارنا بھی درحقیقت خود اس کے اپنے ہی جذبۂ حمایت حق کا ایک قدرتی نتیجہ ہے اور اس کا ایک حصہ ہے پس یہاں تواصی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کے ایک جزء اور اس کی توضیح کی حیثیت سے فرمایا ہے۔"

حق کے لغوی مفہوم کی وضاحت مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں یہ ہے۔

"حق اصل میں تو موجود اور قائم کو کہتے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے اس کے معانی مختلف ہو گئے ہیں، کم از کم تین معنوں میں اس کا استعمال عام ہے:

(۱) وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

(۲) وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلّم ہو۔

(۳) وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو"

گویا تواصی بالحق چھوٹے چھوٹے اخلاقی فرائض کی ادائیگی کی تلقین سے لے کر عقل کے جملہ مسلّمات اور کائنات کے جملہ حقائق کی تبلیغ و اشاعت ـــــ حتیٰ کہ اس "دین الحق" کی شہادت اور اقامت تک پر حاوی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں:۔

"اس سے معاملے کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں، پھر ادائے حقوق کے معاملے میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں"

اب صرف ایک مرحلہ اور باقی ہے ـــ یعنی یہ کہ تواصی بالحق لازماً تواصی بالصبر کو مستلزم ہے صبر اول تو خود حق پر قائم رہنے کے لئے لازمی ہے اس لئے کہ حق پر خود قائم رہنا بغیر اس کے ممکن

نہیں کہ طرح طرح کے لالچ (TEMPTATIONS) اور نفس کے مرغوبات کی کشش کے مقابلے میں انسان اپنے آپ کو تھام کر رکھے اور ہر قسم کے نقصانات اور موانع و مشکلات کے مقابلے کے لئے تیار رہے ـــــ لیکن تواصی بالحق کے مقام پر آنے کے بعد تو صبر و ضبط اور ثبات و استقامت کے عظیم امتحانات سے گزرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی سچائی کا اقرار و اعلان بھی بسا اوقات صبر و ضبط کے عظیم امتحان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ حقیقت پر استقامت بسا اوقات ہاتھ میں دھکتے ہوئے انگارے پکڑنے کے مترادف ہو جاتی ہے تو خود ہی تصور کیجئے کہ عقل کے جملہ مسلّمات اور کائنات کے عظیم حقائق کی تبلیغ و اشاعت کیسے کچھ صبر و استقامت کی متقاضی ہو گی !

اس پر مستزاد یہ کہ ادائے حقوق کا مطالبہ کیا جائے ! اور عدل و انصاف کے قیام کی دعوت دی جائے !! آپ کسی کو کسی چھوٹے سے چھوٹے اخلاقی فرض کی ادائیگی کی تلقین کر کے دیکھئے کہ کیسے چہروں کے رنگ متغیر ہوتے ہیں اور تیوریاں بل کھا جاتی ہیں۔ کسی کو کسی کا غصب شدہ حق واپس کرنے کو کہہ کر دیکھئے کہ کیسی ناگواری (RESENTMENT ـــــ) کا سامنا آپ کو کرنا پڑتا ہے۔ کسی مظلوم کی حمایت میں ایک جملہ منہ سے نکال کر دیکھئے کہ کیسے آپ خود بخود ظالم کے حریف اور مدّمقابل بن جاتے ہیں ! تو خود ہی غور فرمائیے کہ

تمام اخلاقی فرائض کی ادائیگی کی تلقین ـــــ نظام عدل و قسط کے قیام کی دعوت، اور پورے "دین حق" کی اقامت کا مطالبہ ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے

یہ بات کہ حق کی دعوت دی جائے اور باطل اس کے مزاحم نہ ہو ـــــ میزانِ عدل و قسط کو قائم کرنے کا مطالبہ ہو لیکن ظالم اور غاصب خاموش رہیں صرف ایک صورت ہی میں ممکن ہے اور وہ یہ کہ داعیانِ حق در پردہ باطل کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت (COMPROMISE) کئے ہوئے ہوں اور پورے حق کے بجائے اس کے صرف ان اجزاء کی "تبلیغ" میں مصروف ہوں جو وقت کے جباروں اور قہاروں کو بے ضرر معلوم ہو ـــــ ورنہ تواصی بالحق کے تو ہر مرحلے میں ابتلا ناگزیر ہے اور اس کوچے میں ہر قدم ایک نئی آزمائش اور ہر لحظہ ایک نیا امتحان لے کر آتا ہے ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا !

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

مقدمہ

(۲)

نظم — نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن، جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور جو فی الواقع معجزہ ہے بھی، ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے، ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ بس مختلف آیات، مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کر دی گئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے جس کے متعلق دوست دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہل چل پیدا کر دی۔ اذہان و قلوب بدل ڈالے فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔

اگر فی الواقع قرآن میں کوئی نظم و ترتیب نہیں تھی تو پھر تو بہترین ترتیب نزولی ہوتی۔ جس ترتیب سے آیتیں نازل ہوئی تھیں اسی ترتیب کے ساتھ مصحف میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لئے خاص خاص مواقع معین کئے گئے ہیں۔ دوسری مناسب ترتیب مقداری ہو سکتی تھی یعنی آیتیں برابر برابر کی مقدار میں مختلف سورتوں میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ صورت بھی نہیں ہے بلکہ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی اور کتنی چھوٹی سورتیں ہیں جو اپنی سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں۔ یہ سورتوں کی حد بندی بھی کچھ غیر ضروری سی ہو کے رہ جاتی ہے اس لئے کہ حفاظ کی سہولت کے لئے تو یہ پاروں کی حد بندی کافی تھی لیکن ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ سورتوں کی حد بندی اور ان کی ترتیب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے درآنحالیکہ پاروں کی تقسیم بہت بعد کی چیز ہے۔

اس خیال کی انہی کمزوریوں کی وجہ سے شروع ہی سے ہمارے ہاں علماء کا ایک بڑا گروہ بھی رہا ہے

جو قرآن میں نظم کا بڑی شدت سے قائل رہا ہے اور اس گروہ کے بعض اکابر نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ سیوطی "اتقان" میں لکھتے ہیں۔

"علامہ ابوجعفر بن زبیر، شیخ ابوحیان نے نظم قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام "البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن" رکھا، اور ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔"

علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے نظم قرآن کے علاوہ قرآن کے معجزہ ہونے کے پہلو بھی واضح کئے ہیں۔ اسی سلسلے میں نظم قرآن کی اہمیت کا اعتراف وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں

"ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ امام فخرالدین کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حکمت قرآن کا اصلی خزانہ اس کے نظم و ترتیب میں چھپا ہوا ہے۔"

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں آیت ولو جعلناہ قرآنا اعجمیا لقالوا (الآیہ) حم السجدہ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو ازراہ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہم دگر کوئی ربط و تعلق ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کہنا قرآن حکیم پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کو معجز ماننا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے (اس کے بعد تقریباً اٹھارہ سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر اور اس کا نظم بیان کر کے فرماتے ہیں کہ) ہر مصنف جو حق پسند ہے تسلیم کریگا کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورۃ ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرینگی۔"

اسی سلسلہ کی ایک نہایت اہم شخصیت علامہ مخدوم مہائمیؒ بھی ہیں۔ جن کی تفسیر "تبصیر الرحمان وتیسیر المنان"

تفسیر مہائمی کے نام سے نہایت مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق آیات کا نظم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی مسلک کے علم بردار ایک عالم علامہ ولی الدین ملویؒ ہیں نظم قرآن سے متعلق ان کا ارشاد یہ ہے

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت تھوڑا تھوڑا کرکے ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم نہیں تلاش کرنا چاہیئے، ان کو دھوکا ہوا ہے۔ قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسب حالات جستہ جستہ ہوا ہے لیکن اس کی ترتیب میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے"۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہے کہ نظم قرآن سے متعلق ایک گروہ میں اگر غلط خیال موجود رہا ہے تو شروع ہی سے ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جس کا نظریہ بالکل صحیح ہے اور اس نے اپنے نظریئے کے مطابق کتاب الٰہی کی خدمت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جو لوگ نظم کے منکر ہوئے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں منکر ہوئے ہیں کہ ان کے پاس انکار نظم کی کوئی دلیل موجود تھی یا وہ بے نظمی ہی کو کلام کا کوئی ہنر سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں قرآن مجید میں جگہ جگہ بے نظمی محسوس ہوئی اور وہ اس کا کوئی حل نہ پا سکے تو جو کمزور سے کمزور آڑ بھی انہیں ملی اسی آڑ میں انہوں نے پناہ لے لی۔

اگرچہ ان کے لئے صحیح روش تو یہ تھی کہ یہ قرآن کو مہتم کرنے کے بجائے سارا الزام اپنی کوتاہی ہمت پر لیتے لیکن انصاف کیجئے تو دو باتیں ان کے حق میں بھی جاتی ہیں جن کے سبب سے ان کو معذور قرار دینا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ نظم قرآن کی تلاش ہے ہی ایسا کام کہ ہر شخص اس کو کسی کے لئے اپنی زندگی وقف نہیں کر سکتا۔ دوسری یہ کہ جن لوگوں نے قرآن میں نظم کا دعویٰ کیا، ان کی خدمات کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں پیش کر سکے جو اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی۔ اوپر جن بزرگ مصنفوں کے اقوال و ارشادات نقل ہوئے ہیں ان میں سے تین بزرگوں کی کتابوں سے استفادے کا موقع مجھے نصیب ہوا ہے۔ میں بلا کسی ارادۂ تحقیر کے عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کی کتاب سے بھی مجھے کسی مشکل کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ مہائمیؒ اور رازیؒ کی تفسیریں عرصے تک میرے مطالعے میں رہی ہیں۔ بلکہ رازیؒ کی تفسیر تو اب بھی پیش نظر رہتی ہے۔ یہ حضرات جس قسم کا نظم بیان کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اس قسم کا نظم ہر دو غیر متعلق چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے۔

اصل ضرورت اس چیز کی تھی کہ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز آتی جو قرآن کے نظم کو اس طرح واضح کر دیتی کہ ہر صاف ذہن قاری کو وہ اپنے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی، لیکن اس طرح کی کوئی چیز نہ صرف یہ کہ لوگوں کے سامنے آئی نہیں بلکہ جو چیزیں آئیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، مایوس کن ثابت ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نظم کی تلاش کو 'کوہ کندن کاہ برآوردن' کا مصداق سمجھ لیا۔

اس راہ میں سب سے پہلی کامیاب کوشش کی سعادت میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کو حاصل ہوئی۔ مولانا نے بے شک اس کے حق میں نہایت مؤثر و دل نشیں انداز میں دلائل بھی دیئے، اور متعدد سورتوں کی تفسیر بھی انہوں نے لکھی جن کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر سورہ نہایت حسین نظم کا نہایت دل آویز پیکر ہے۔ نظم کے دلائل پر مولانا کا جو رسالہ "دلائل النظام" کے نام سے موسوم ہے وہ تو اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے لیکن مولانا کی تفسیر کے کچھ اجزا اور تفسیر کا مقدمہ عربی اور اردو دونوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو ذہین اور منصف مزاج بھی ان کا مطالعہ کرے گا وہ دو باتوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو اس بات کا کہ قرآن مجید کے اندر نظم کا انکار قرآن پر بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری اس بات کا کہ قرآن کے معارف و حکم کا اصل خزانہ درحقیقت اس کے نظم ہی کے اندر پوشیدہ ہے۔

اگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مہلت دی ہوتی کہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق اپنی تفسیر مکمل کر پاتے تو یہ چیز ہر مخالف کے اوپر حجت ہوتی لیکن یہ ہماری محرومی ہے کہ ان کی تفسیر کا بہت تھوڑا حصہ لکھا جا سکا۔ خاص طور پر بڑی سورتوں میں سے تو کسی ایک سورہ کی تفسیر بھی وہ مکمل کر سکے یہ چیز بعض لوگوں کے ذہن میں کھٹک پیدا کرتی ہے کہ ممکن ہے مولانا کو چھوٹی سورتوں کے نظم بیان کرنے میں جو کامیابی ہوئی ہے، وہ کامیابی ان کو بڑی سورتوں کے نظم کھولنے میں نہ ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض بڑی سورتوں، مثلاً بقرہ اور آل عمران میں بظاہر نظم کی جو مشکلات نظر آتی ہیں، چھوٹی سورتوں میں اس طرح کی مشکلات نہیں ہیں۔ خاص طور پر بقرہ تو سمجھیے کہ ہمت شکن مشکلات کا مجموعہ ہے۔ میں نے اسی خیال سے جب تفسیر پر کام شروع کیا تو اس کا آغاز فاتحہ سے کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور توفیق بخشی سے میں بقرہ اور آل عمران کی مشکلات حل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ چیز لوگوں کا تردد دور کرنے میں بڑی مؤثر ثابت ہوگی۔ مجھے اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ تو اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے ہی کر سکیں گے۔ میں جو کچھ عرض کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے کسی مقام میں بھی بات بنانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر میرا ذہن و ضمیر پوری طرح مطمئن ہے۔ امکان ہے تو دو باتوں کا، جن سے میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دے سکتا۔ ایک اس کا کہ کہیں میری عقل

(باقی)

مولانا امین احسن اصلاحی

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۃ آل عمران

(۱۱)

۱۳۲ء آگے کا مضمون آیات ۱۴۴-۱۴۸

آگے کی آیات میں پہلے یہ غلط فہمی دور فرمائی کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کوئی فوق بشر ہستی نہیں ہیں وہ اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔ جس طرح بہت سے رسول گزر چکے ہیں اس طرح ایک دن ان کو بھی بہرحال وفات پانا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ شہید کر دیئے جائیں لیکن اللہ کے دین کو ہمیشہ باقی رہنا ہے تو اس دین کے ساتھ آدمی کی وابستگی اس مفروضہ پر مبنی نہیں ہونی چاہیئے کہ آپ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے آئے ہیں۔ اس غلط فہمی کی اصلاح اس لئے ضروری تھی کہ اگر اس قسم کا کوئی وہم دلوں میں چھپا ہوا رہتا تو آپ کی وفات پر سب کے دل بیٹھ جاتے اور منافقین و معاندین اسلام کی مخالفت میں اس سے بڑا فائدہ اٹھا سکتے۔ چنانچہ جوں ہی اس غلط فہمی کی موجودگی کے کچھ آثار نمایاں ہوئے قرآن نے اس کی اصلاح فرما دی۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو یہ خبر بھی مشہور ہو گئی کہ خود سرورِ عالمؐ بھی شہید ہو گئے۔ اس اندوہناک خبر نے بہت سے مسلمانوں کے حوصلے بالکل پست کر دیئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ جب حضورؐ ہی شہید ہو گئے تو اب بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ذی ہوش لوگوں نے یہ کہہ کر حالات کو سنبھالا کہ جب حضورؐ شہید ہو گئے تو ہمارے زندہ رہنے سے کیا حاصل، ہمیں بھی اسی مقصدِ حق کیلئے شہید ہو جانا چاہیئے جس کے لئے حضورؐ شہید ہوئے، تاہم مسلمانوں کے اندر یہ ایک ایسی کمزوری نمایاں ہوئی تھی جس کی بروقت اصلاح خود قرآن کی زبان سے ضروری تھی تاکہ آئندہ کے لئے فتنوں کا سدِّ باب ہو جائے۔

اس کے بعد پچھلے انبیاء اور ان کے جاں نثار صحابہ کا ذکر بطور مثال کیا ہے کہ انہیں بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا پڑا، اور اس راہ میں انہیں تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پہنچیں لیکن وہ دل شکستہ نہ ہوئے تو پھر تم کو اگر

شکست ہوئی یا نہارے پیغمبر کو کوئی تکلیف پہنچی تو تم کیوں دل شکستہ ہوتے ہو تم بھی انہی کی روش اختیار کرو جب کہ اس کام کے لئے اٹھے ہو جس کے لئے وہ اٹھے تھے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے ارشاد ہے:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

ترجمہ

"محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیئے گئے تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے جو پیٹھ پیچھے پھر جائیگا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا۔" (۱۴۴)

"اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔ جو دنیا کا صلہ چاہتے ہیں ہم انہیں دنیا میں سے دیتے ہیں اور جو اجر آخرت کے طالب ہیں ہم انہیں اس میں سے دیں گے اور ہم شکر گزاروں کو بھرپور صلہ دیں گے۔" (۱۴۵)

"اور کتنے انبیاء گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کے سبب سے جو انہیں خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو پست ہمت ہوئے، نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ان کی دعا تو ہمیشہ بس یہ رہی کہ اے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملے میں ہماری بے اعتدالیوں کو بخش دے، ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں کے مقابل میں ہماری مدد فرما۔ تو اللہ نے ان کو دنیا کا صلہ بھی عطا فرمایا، اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا، اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔" (۱۴۶-۱۴۸)

۳۳- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

'عقب' کے معنی ایڑی کے ہیں۔ انقلب علی عقبیہ بیٹھ پیچھے پھرنے کی تعبیر ہے یہاں اس سے مراد اسلام کو چھوڑ کر پھر جاہلیت کی طرف مڑ جانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزرے ہیں اسی طرح محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بھی اللہ کے ایک رسول ہیں۔ جس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں دوسرے رسولوں کو پیش آئیں اسی طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں انہیں بھی پیش آسکتی ہیں جس طرح تمام رسولوں کو موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا انہیں بھی ایک دن وفات پانا ہے۔ ان کے رسول ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ وفات نہیں پائیں گے یا قتل نہیں ہو سکتے یا کسی مصیبت یا ہزیمت کا ابتلاء انہیں پیش نہیں آسکتا۔ اگر کسی نے اس غلط فہمی کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا اور اب احد کے حادثے کے بعد کسی تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ از سرِ نو جاہلیت کی زندگی کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو پلٹ جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا بلکہ اپنی ہی دنیا اور آخرت برباد کرے گا جو لوگ اسلام کو دیکھ کر بھی جاہلیت اور اسلام کے فرق کو سمجھ نہ سکے اور اسلام کے قدر داں نہ بنے اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات کا حقدار اُن کو سمجھتا ہے جو اسلام کی نعمت پانے پر اپنے رب کے شکر گزار ہیں۔ جاہلیت کی طرف بازگشت کا ان کے ذہن میں خیال بھی نہیں گزرتا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۱۴۵)

'کتابا موجلا' اس طرح کی ترکیب ہے جس طرح وعد اللہ یا صنع اللہ الذی اتقن وغیرہ ہے۔

اس آیت میں کمزور اور منافق قسم کے لوگوں کی دو کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے۔

ایک یہ کہ اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہر شخص کی موت کے لئے ایک نوشتۂ الٰہی ہے جب تک اس نوشتہ کی مقررہ مدت پوری نہیں ہوگی اس وقت تک کسی کی موت نہیں آسکتی۔ اسی طرح جب نوشتہ پورا ہو جائے گا تو کسی کی موت ایک منٹ کے لئے ٹل بھی نہیں سکتی۔ اس وجہ سے خدا کے مقرر کردہ فرائض سے فرار کے بجائے آدمی کے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ عزم و جزم کے ساتھ اپنا فرض ادا کرے اور موت کے معاملے میں اطمینان رکھے کہ اس کا وقت بھی خدا کے ہاں لکھا ہوا ہے اور اس کی شکل بھی

متعین ہے۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ یہ اپنے دنیوی مفادات کو تمام تر اپنی سعی و تدبیر ہی پر منحصر سمجھتے ہیں اور یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ اگر آخرت کے پیچھے زیادہ پڑے تو دنیا سے یک قلم محروم ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ خدا دنیا کے طالبوں کو دنیا میں سے اتنا ہی حصہ دیتا ہے جتنا ان کے لئے مقدر ہوتا ہے لیکن وہ آخرت سے محروم رہتے ہیں۔ برعکس اس کے جو آخرت کے طلب گار رہتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو آخرت کے انعامات سے بھی نوازتا ہے اور دنیا میں سے بھی ان کو دیتا ہے جتنا ان کے لئے مقدر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ آدمی آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا کا بندہ بن کر رہ جائے بلکہ یہ ہے کہ آخرت کا طالب بنے اور دنیا میں سے اللہ تعالیٰ جو کچھ بخشے اس پر قناعت کرے۔ آگے کی آیت میں اس مضمون کی وضاحت آ رہی ہے۔

وسنجزی الشاکرین میں قرینہ دلیل ہے کہ فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور 'شاکرین' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کے دل سے قدر دان ہیں جو انہیں آخری اور کامل ہدایت کی صورت میں ملی ہے۔ فرمایا کہ ہم انہیں اس قدر دانی کا بھرپور صلہ دیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اس روشنی کو دیکھ کر بھی ظلمت ہی کے طالب ہیں وہ تاریکی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیئے جائیں گے۔

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ (۱۴۶) وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ (۱۴۷) فَاٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ‌ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (۱۴۸)

وہن، ضعف اور استکانت

'ربی' اور 'وھن' کے الفاظ پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ وہن، ضعف اور استکانت کے الفاظ اگرچہ اظہار کمزوری کے مفہوم کے لئے کچھ مشترک سے ہیں لیکن ان تینوں میں ایک نازک سا فرق بھی ہے۔ موت کے خوف اور زندگی کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے، یہ وہن ہے۔ اس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے وہ ضعف ہے۔ اس ضعف سے حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے وہ استکانت ہے۔

انبیاء اور ان کے صحابہ کی ایک صفت

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں گزر چکی ہیں کہ اللہ کے نبیوں نے جہاد کیا ہے اور اس جہاد میں اللہ کے بہت سے نیک بندوں نے ان کا ساتھ دیا ہے اور انہیں اس راہ

میں مصیبتوں اور ہزیمتوں سے بھی سابقہ پیش آیا ہے لیکن اس چیز کا اثر ان پر یہ نہیں پڑا کہ وہ ہمت ہار جائیں۔ بھڑولا پن دکھائیں یا دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دیں بلکہ انہوں نے راہ حق میں استقامت دکھائی اور اللہ ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

یہ اشارہ ہے ان جنگوں کی طرف جو حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام اور بعض دوسرے انبیا کو لڑنی پڑیں۔ حضرت سموئیلؑ کے زمانے کی ایک جنگ کا جو غزوہ بدر سے مشابہ تھی، ذکر سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ مقصود اس اشارے سے ان لوگوں کو جو احد کی شکست سے بددل ہو رہے تھے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ نہ تو نبی اور اس کے صحابہ کے لئے جنگ کا پیش آنا کوئی انوکھی بات ہے اور نہ مصائب و شدائد سے ان کا گزرنا کوئی نیا حادثہ ہے۔ یہ انبیا کی ایک سنت اور خدا کے قانونِ ابتلا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو نبی ہوتا ہے وہ اور اس کے ساتھی امتحان سے گزرے بغیر ہی منزل پر جا پہنچتے ہیں۔ اللہ کو محبوب تو صرف وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں استقامت دکھائیں نہ کہ ہر مدعیِ دینداری۔ پھر جھوٹے اور سچے میں امتیاز آخر اس امتحان کے بغیر کیسے ہوگا؟

وما کان قولھم الا ان قالوا (الآیہ) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں جب مصیبتیں اور آزمائشیں پیش آئیں تو انہوں نے اس طرح کی باتیں نہیں بنائیں جس طرح کی باتیں آج کمزور قسم کے مسلمان اور منافق لوگ بنا رہے ہیں، اور پیغمبرؐ کے خلاف طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا کر رہے ہیں، بلکہ جو افتاد انہیں پیش آئی اس کو انہوں نے خدا اور رسول کیطرف منسوب کرنے کے بجائے خود اپنی کمزوری اور اپنے تجاوز پر محمول کیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ دنیا میں بھی خدا نے ان کو اقتدار اور حکومت سے سرفراز فرمایا اور آخرت میں بھی ان کے لیے نہایت اعلیٰ صلہ و انعام موجود ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو مرتبہ احسان پر فائز ہیں اور اللہ ایسے ہی خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

۴۴۔ آگے کا مضمون آیات ۱۴۹ - ۱۵۵

آگے بھی انہی کمزوریوں پر تبصرہ ہے جو جنگ احد اور اس کی شکست سے ابھر کر سامنے آئی تھیں قرآن نے ان میں سے ایک ایک کو لیکر ان کے باطن کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی ہیں اور اس آزمائش سے مسلمانوں کی تربیت و تطہیر کے جو مصالح پورے ہوئے ہیں انکی طرف اشارے فرمائے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ
بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا

بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

ترجمہ "اے ایمان والو، اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو یہ تمہیں پیٹھ پیچھے لوٹا کے رہیں گے اور تم نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔ تمہارا مولیٰ تو اللہ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ ہم ان کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیں گے کیونکہ انہوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے" (۱۴۹ - ۱۵۱)

"اور اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا وہ سچ کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم خود ڈھیلے پڑ گئے اور حکم میں تم نے اختلاف رائے کیا اور رسول کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کے تم تمنائی

تھے۔ تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے، اور کچھ آخرت کے پھر خدا نے تمہارا رُخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائش میں ڈالے اور اللہ مسلمانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ یاد کرو، جب کہ تم منہ اٹھائے بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور خدا کا رسول تم کو تمہارے پیچھے سے پکار رہا تھا تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تاکہ تم دل شکستہ نہ ہوا کرو، نہ کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔" (۱۵۲-۱۵۳)

"پھر خدا نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا یعنی جو نیند آکر تم میں سے ایک گروہ کو چھا لیتی ہے اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ یہ خدا کے بارے میں خلاف حقیقت زمانہ جاہلیت کے قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے۔ یہ کہتے رہے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل؟ کہہ دو سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر اس امر میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتلگاہوں تک پہنچ کے رہتے۔ یہ اس لئے ہوا کہ اللہ تم میں امتیاز کرے، جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کو پرکھے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو صاف کرے۔ دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن جو لوگ تم میں سے پھر گئے ان کو شیطان نے ان کی بعض کرتوتوں کے سبب سے پھسلا دیا اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔" (۱۵۴-۱۵۵)

۳۵- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ

احد کی شکست کے بعد کفار اور یہود نے یہ چاہا کہ بدر کی فتح کے اثرات کو یک قلم مٹا کے رکھ دینگے چنانچہ انہوں نے منظم پروپیگنڈے سے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ محمدؐ خدا کے کوئی فرستادہ ہیں اور ان کو خدا اور فرشتوں کی مدد حاصل ہے اگر یہ بات ہوتی تو تم احد میں شکست کیوں کھاتے؟ بدر میں تم نے فتح حاصل کی، احد میں ہم فتحمند رہے۔ یہ تدبیر اور وسائل کا

کفار اور منافقین کا پروپیگنڈہ

کھیل ہے۔ اس کو خدا اور اس کے فرشتوں سے وابستہ کر دینا اور اپنے آپ کو خدا کی مدد کا اجارہ دار سمجھ بیٹھنا محض طفلانہ خام خیالی ہے۔

پروپیگنڈے کا جواب

کفار کا یہ پروپیگنڈا ان مسلمانوں پر اثر انداز ہوا جو کمزور قسم کے تھے۔ منافقین نے بھی اپنی وسوسہ اندازیوں سے اس کو تقویت پہنچائی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ اگر تم نے ان کفار کی باتوں کا اثر قبول کیا تو یہ تم کو پھر اسی جاہلیت کی تاریکی میں واپس لے جائیں گے جس سے نکال کر خدا تمہیں اسلام کی روشنی کی طرف لایا ہے اور تمہاری کامیابی پھر نامرادی سے بدل جائیگی۔ تمہارے ولی و مرجع یہ کفار نہیں ہیں کہ تم اپنی مشکلات اور پریشانیوں میں ان سے رجوع کرو اور ان سے رہنمائی چاہو بلکہ تمہارا مرجع و مولیٰ اللہ ہے تم اس کی طرف رجوع کرو اور اس سے مدد چاہو، وہ بہترین مددگار ہے۔ اوپر 'لا تتخذوا بطانۃ' والی آیت میں بھی یہی مضمون گزر چکا ہے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ (۱۵۱)

یعنی اس وقت جو ذرا ان کا حوصلہ بڑھ گیا ہے تو یہ محض ایک وقتی فتح کا عارضی نشہ ہے۔ اس کی کوئی پائیدار بنیاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے حوصلے پست کر دے گا اور ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کا رعب ڈال دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسی چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے جن کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے، نہ نظام کائنات میں اور نہ خدا کے اتارے ہوئے صحیفوں میں۔ ایسی وہمی چیزیں اول تو حقائق کے مقابلے میں کچھ سہارا نہیں دے سکتیں، دوسرے اتنے مختلف دیوتاؤں کے ساتھ ان کی وابستگی ان کے دل کو اس طرح منتشر اور پراگندہ کئے ہوئے ہے کہ ان کو وہ دل جمعی و یکسوئی کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی جو تمام عزم اور حوصلے کی بنیاد ہے۔ آیت میں 'ظالمین' سے مراد مشرکین ہیں۔ شرک کو ظلم سے تعبیر کرنے کی وجہ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ از انجملہ یہ بات بھی ہے کہ شرک درحقیقت انسان کا خود اپنے نفس پر بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے اشرف بنایا ہے۔ اس شرف کا احساس ہی ہے جس کے اندر اس کی تمام قوت و عظمت کا راز مضمر ہے۔ انسان جب اپنے سے فروتر مخلوقات کو اپنا رازق و حاکم مان کر ان کی پرستش کرنے لگتا ہے تو گویا وہ شاہین ہو کر کنجشک فرومایہ کی غلامی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی شاہینی کھو دیتا ہے بلکہ کنجشک سے بھی زیادہ حقیر و فرومایہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث مکی سورتوں میں آئے گی۔

شرک کی کوئی بنیاد نہیں

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ
تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ
يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ
وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵۲)

حس یحس

'حس یحس' کے معنی دشمن کو اس طرح قتل کرنے کے ہیں کہ اس کو بالکل پامال اور اس کا استیصال کر کے رکھ دے 'باذنہٖ' کا مفہوم یہ ہے۔ کہ یہ شاندار نتیجہ محض تمہاری تدبیر اور تمہاری قوت کا کرشمہ نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ تھا۔

فشل

'فشل' کے معنی سست پڑ جانے، ڈھیلے پڑ جانے اور کمزوری دکھانے کے ہیں۔

تنازع فی الامر

'تنازع فی الامر' تنازع فی الحدیث سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ تنازع فی الحدیث کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک بات میں کوئی شخص کچھ رائے دے، دوسرا کچھ رائے دے اسی طرح تنازع فی الامر کا مطلب اس موقع پر یہ ہے کہ نبیؐ نے جو حکم دیا اس کی تعمیل میں کسی نے کچھ موقف لیا، کسی نے دوسرا موقف لیا

ما تحبون

'ما تحبون' میں اشارہ فتح کی تمنا کی طرف ہے۔ قرآن نے بعض جگہ اس ابہام کو کھول بھی دیا ہے مثلاً سورہ صف میں ہے۔ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (اور دوسری ایک اور چیز بھی ہے جس کو تم محبوب رکھتے ہو، یعنی اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح)

احد میں شکست کی وجہ

اب یہ اس پروپیگنڈے کی تردید ہو رہی ہے جو کفار و منافقین نے پھیلانا شروع کیا تھا — کہ مسلمان خواہ مخواہ کو اس خبط میں مبتلا ہیں کہ خدا اور اس کے فرشتے ان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر مدد کرتے ہیں تو یہ مدد احد میں کہاں چلی گئی؟ اوپر آیت ۱۴۹ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کمزور قسم کے مسلمان اس پروپیگنڈے سے مسموم ہوئے۔ اس فتنہ سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے قرآن نے آگاہ فرمایا کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کے پورے ہونے کا تعلق ہے وہ تو احد میں بھی پورا ہوا، اس لئے کہ شروع شروع میں تم نے کفار کو خوب تہ تیغ کیا، یہاں تک کہ وہ پسپا ہو گئے اور فتح بالکل تمہارے سامنے تھی لیکن قبل اس کے کہ تم دشمن کو اچھی طرح کچل کے اس کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیتے، تم ڈھیلے پڑ گئے۔ رسولؐ نے پشت کے درے کی حفاظت پر جن لوگوں کو اس قطعی ہدایت کے ساتھ مامور کیا تھا کہ وہ کسی حال میں بھی اس کو نہ چھوڑیں، انہوں نے رسول کے حکم کے منشا کے تعین میں اختلاف کیا اور ان کی اکثریت یہ سوچ کر کہ اب تو فتح سامنے ہے رسولؐ کے حکم کے خلاف مال غنیمت حاصل کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تم میں کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ لوگ آخرت کے۔ اسلام کی صفوں میں ایسے

لوگوں کا موجود ہونا، جو دنیا کے لئے رسول کے حکم کو نظر انداز کر دیں، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ تمہیں امتحان میں ڈالے تاکہ جو لوگ دنیا کے طالب ہیں وہ تم سے چھٹ کر الگ ہو جائیں چنانچہ اس نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا اور تمہاری فتح شکست سے بدل گئی۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اللہ کا وعدۂ نصرت غیر مشروط نہیں ہے کہ وہ جو رویہ بھی چاہیں اختیار کریں لیکن خدا کی نصرت ہر حال میں ان کے ہمرکاب ہی رہے بلکہ یہ مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ مسلمان ادائے فرض میں ڈھیلے نہ پڑیں، اطاعت امر میں اختلاف نہ کریں، خدا اور رسولؐ کی نافرمانی نہ کریں، آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے طالب نہ بنیں۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز ان کے اندر پائی جاتی ہے تو بھی اللہ تعالیٰ یہ نہیں کرتا کہ ان پر اپنا غضب نازل کر دے بلکہ ان کو ایسی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے جن سے ان کی یہ کمزوریاں دور ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی تائید و نصرت کے سزاوار بن سکیں۔ خدا کا وعدہ نصرت مشروط ہے

یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر اور اس کے فضل و عنایت ہی کی ایک شکل ہوئی۔ چنانچہ آیت کے آخر میں اس عفو اور فضل کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔

غزوۂ احد کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس امر پر تمام ارباب سیر متفق ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا ابتدائی حملہ بہت کامیاب رہا۔ انہوں نے دشمن پر غلبہ پا لیا تھا لیکن ایک دستہ جو ایک اہم درّے کی حفاظت پر مامور تھا اور جس کو حضورؐ کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی جگہ کو نہ چھوڑے قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔ صرف تھوڑے سے آدمی اس دستے کے اپنی جگہ پر قائم رہے اس چیز سے دشمن کے ایک دستہ نے فائدہ اٹھایا اور کاوا کاٹ کر اس نے پشت سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ایسا اچانک اور کامیاب ہوا کہ مسلمان اوسان کھو بیٹھے۔ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۵۳)

'اصعاد' کے اصل معنی کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کے ہیں اسی سے اصعد فی العدو کا محاورہ نکلا۔ جس کے معنی کسی سمت میں منہ اٹھائے بھاگ کھڑے ہونے کے ہیں۔ اصعاد

غما بغم میں 'ب' تلبس کے مفہوم میں ہے یعنی ایک غم تو شکست کا تھا ہی اس کے ساتھ لپٹا ہوا ایک اور غم بھی سامنے آگیا۔ ہمارے نزدیک اس غم سے مراد وہ غم ہے جو اس دوران میں مسلمانوں کو کفار کی اڑائی ہوئی اس افواہ سے پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیئے گئے۔ اس غما بغم

اوناہ کا ذکر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں بھی ہے اور قرآن کی اس آیت سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے اس لئے کہ فرمایا ہے کہ تم اس طرح بگٹٹ بھاگے چلے جا رہے تھے کہ تمہیں اپنے دہنے بائیں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تم ذرا مڑ کر دیکھ سکتے کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس سول کی طرف بھی تم نے توجہ نہیں کی جو تمہارے پیچھے سے تمہیں برابر پکارتا رہا کہ اللہ کے بندو، میری طرف آؤ۔ اس کے بعد 'ف' کے ساتھ جو عربی میں نتیجہ کے بیان میں آتی ہے اس غم کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ غم پیغمبر کی ذات ہی سے متعلق ہوگا تا کہ پیغمبر کی جو ناقدری ان سے صادر ہوئی ہے اس پر ان کو تنبیہ کی جائے۔

اس آیت کا نظام

اس آیت کے نظام کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اوپر والی آیت پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اوپر فرمایا تھا کہ ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم یعنی خدا نے تمہاری فلاں فلاں غلطیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے تمہیں پسپا کر دیا تا کہ تمہیں ابتلا میں ڈالے۔ اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ یہ ابتلا میں ڈالنا اس لئے ہوا کہ خدا نے تم کو تمہاری غلطی پر سزا دینے کے بجائے یہ پسند فرمایا کہ تمہیں معاف کرے۔ اور تم پر اپنا فضل فرمائے اس کے بعد اذ تصعدون سے لے کر فاثابکم غما بغم تک اس ابتلا کی تفصیل ہے۔ پھر لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم ولا ما اصابکم میں اس ابتلا کا وہ فائدہ مذکور ہوا ہے جو اہل ایمان کو حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اس کا حق ادا کریں۔

ابتلا کا مقصد

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ ابتلا خدا کا عذاب نہیں ہے بلکہ اس کی رحمت ہے۔ عذاب کفار پر آتا ہے اور ابتلا میں اہل ایمان مبتلا کئے جاتے ہیں۔ عذاب کا مقصد کفار کو مٹانا ہوتا ہے اور ابتلا کا مقصد اہل ایمان کو عقلی و اخلاقی کمزوریوں سے پاک کرنا۔ ایک موت ہے دوسرا زندگی۔ قانون الٰہی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس وقت تک وہ اس کے جرموں پر اس طرح کی سزا نہیں دیتا جس طرح کی سزا مجرموں اور باغیوں کو دی جاتی ہے بلکہ مختلف آزمائشوں اور امتحانوں کے ذریعہ سے اس کے اندر پیدا ہونے والی بیماریوں کو وہ دور فرماتا رہتا ہے۔ ہلاکت کے حوالہ وہ کسی قوم کو اسی وقت کرتا ہے جب وہ زندگی کے اصلی اوصاف سے بالکل خالی ہو جاتی ہے۔

ابتلا میں حزن سے مراد عزم کی شکستگی

رہا یہ سوال کہ احد کے اس ابتلا میں حزن سے بچانے والی کیا بات تھی تو اس کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھئے کہ یہاں حزن سے مراد وہ عام رنج و غم نہیں ہے جو کسی موقع کے ضائع ہو جانے یا کوئی نقصان پہنچ جانے پر فطرتاً ہو جایا کرتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ مایوسی اور اور دل شکستگی ہے جو انسان کے عزم و حوصلہ کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ اوپر آیت ۱۳۹ لا تھنوا ولا

تحزنوا میں اسی حزن سے منع فرمایا ہے۔ یہ مایوسی و دل شکستگی پیدا کرنے والے متعدد اسباب اس وقت موجود تھے جو اصلاح و علاج کے محتاج تھے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ جو شخص نبی ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو لازماً ہر مہم میں کامیابی ہی حاصل ہونی چاہیئے، ان کے لئے شکست ان کے نزدیک ان کے تمام دعوے کو مشتبہ کر دینے کے مترادف تھی، اسی طرح ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس وہم میں مبتلا تھا کہ جب ہم مسلمان ہیں اور پیغمبرؐ کا ساتھ ہم نے دیا ہے تو ہمیں اپنی غلطیوں کے خمیازے سے بالاتر ہونا چاہیئے، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا سارا اعتماد اپنی رائے اور اپنی تدبیروں پر ہی تھا، ان پر یہ حقیقت واضح نہیں تھی کہ اس دنیا میں تدبیر ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ اصلی کارفرما تقدیر ہے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا، جو خدا کے بارے میں اس طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا تھے جو زمانہ جاہلیت کی باقیات میں سے تھیں۔ ان تمام گروہوں کی طرف آگے کی آیات میں اشارات آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اتنی ساری غلط فہمیاں اور خام خیالیاں مسلمانوں میں موجود تھیں تو ان کے ہوتے ہوئے ناممکن تھا کہ وہ ان حالات و مشکلات کا مقابلہ کر سکتے جن سے وہ ہر قدم پر دوچار تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس غزوۂ احد کے ابتلا کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان بہت سی خام خیالیوں سے پاک کر دیا جن سے نازک اوقات میں ان کے عزم و حوصلے کو تزلزل پیش آ سکتا تھا۔ ان مضامین کو کھولنے والی جو آیتیں خود اس سورہ میں ہیں وہ بعض اوپر گزر چکی ہیں اور بعض آگے آ رہی ہیں البتہ سورۂ حدید کی ایک آیت ہم یہاں نقل کرتے ہیں اس سے ایک نہایت اہم گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (۲۲-۲۳)

"تمہیں جو مالی یا جانی تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ ہم نے وجود میں لانے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ رکھی ہے یہ اللہ کے لئے ایک معمولی بات ہے تاکہ تم غم نہ کرو اگر کوئی موقع تم سے کھو جائے اور نہ اتراؤ اس چیز پر جو اس نے تم کو بخشی ہے اللہ اکڑنے والے اور فخر والے کو پسند نہیں کرتا۔"

ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَل لَّنَا

مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ۗ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۗ يُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۗ
يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۗ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُيُوْتِكُمْ
لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ
وَلِيُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

امنۃ

'امنۃ' کے معنی راحت، سکون اور اطمینان کے ہیں۔ 'نعاس' اونگھ اور نیند کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ بدلیت کے طریقے پر 'امنۃ' کی گویا وضاحت ہے۔ نیند، اطمینان و راحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی شہادت بھی۔ جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اڑ جایا کرتی ہے اور ایسے شخص کے لئے کوئی کام عزم و حوصلہ اور استقلال و عزیمت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دوران جنگ میں فوج کے لئے سونے کا موقع ملنا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ نیند کی اسی اہمیت کی وجہ سے دشمن فوج کے حوصلہ کو پست کرنے والی تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوتا ہے اگر کسی فوج کو اس کا موقع ملے، اور وہ اس سے فائدہ بھی اٹھا سکے کیونکہ اس سے فائدہ اٹھا سکنا صرف موقع ملنے ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی و قلبی صلاحیت پر بھی ہے۔ غزوہ بدر سے متعلق سورۂ انفال میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر جو احسانات گنائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جنگ سے پہلے والی رات میں خوب سوئے اور اس طرح صبح کو لڑنے کے لئے خوب چاق و چوبند ہو گئے۔ یہاں آیت زیر بحث میں فرمایا ہے کہ ایک گروہ تو آرام سے سویا لیکن ایک دوسرے گروہ کو برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ اگرچہ دشمن واپس جا چکا تھا۔ لیکن وہ اپنے خوف اور بزدلی کے سبب سے یہی سمجھتے رہے کہ ابھی وہ سر ہی پر کھڑا ہے۔

جنگی نقطۂ نظر سے نیند کی اہمیت

'یغشیٰ طائفۃ' میں حال کا صیغہ صورت حال کی تصویر کے لیے ہے۔ یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاہلیۃ، میں 'ظن الجاہلیۃ' غیر الحق کی وضاحت ہے اور مقصود اس وضاحت سے ان کے خیال کے کھوٹے پن کو ظاہر کرنا ہے کہ باوجودیکہ یہ لوگ مسلمان بنے پھرتے ہیں لیکن اب تک خدا کی صفات اور انسانی زندگی سے اس کے تعلق کے باب میں ان کے خیالات و تصورات وہی ہیں جو زمانۂ جاہلیت کی تاریکی میں تھے۔ یقولون لو کان لنا الآیۃ ان کے ظن جاہلیت کی ایک مثال بھی ہے اور وہ اپنے دل میں جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا اظہار و بیان بھی۔

ظن اہل جاہلیۃ

ولیبتلی اللہ کا معطوف علیہ حذف ہے اور اس طرح کے مواقع میں نہ صرف یہ کہ معطوف علیہ

حذف کی ایک مثال

محذوف ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ چیز بھی محذوف ہوتی ہے جس کی ان صیغوں کے ذریعے سے علت بیان ہوتی ہے۔ اس کی مثال سورۂ حدید کی اس آیت میں بھی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے اگر سیاق و سباق کی روشنی میں اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی کہ " اگر تم اپنی ہی رائے پر عمل کرتے جب بھی تم اگر تمہاری موت مقدر ہو چکی ہوتی، اپنے آپ کو موت سے نہ بچا سکتے بلکہ انہی مقامات میں پہنچ کر قتل ہوتے جن مقامات میں تمہارا قتل ہونا لکھ رکھا ہے لیکن یہ رسول کے ہاتھوں اللہ نے اس لئے کرایا کہ تمہارے دلوں میں یہ حسرت کا ایک کانٹا بنے اور تمہارے دلوں میں جو کمزوریاں ہیں وہ ابھر کر سامنے آئیں ۔

احد کے واقعات پر تبصرہ

یہ آیت بھی پوری کی پوری احد کی شکست سے ظاہر ہونے والے واقعات و حالات پر تبصرہ ہے۔ اور مقصود اس تبصرے سے جیسا کہ اوپر واضح ہوا، یہ دکھانا ہے کہ نبی اور اہلِ ایمان کے لئے اللہ کی نصرت کا وعدہ برحق ہے لیکن جماعت کے اندر جو کمزوریاں چھپی ہوئی تھیں ان کا علاج بھی ضروری تھا۔ فرمایا کہ احد کی شکست کے بعد تم میں ایک گروہ تو بے شک ایسے لوگوں کا رہا جو خدا اور رسول سے شاکی اور بدگمان نہیں ہوا۔ اس نے اپنا حوصلہ قائم رکھا۔ اس نے اس افتاد کو جو پیش آئی جماعت ہی کی بعض خامیوں کا نتیجہ سمجھا اور خدا کے فیصلہ پر راضی رہا چنانچہ بد دل و ہراساں ہونے کے بجائے وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے آنے والی شب میں اطمینان کے ساتھ سویا جو اس کی دلجمعی اور ایمانی مضبوطی کی ایک شہادت ہے لیکن ساتھ ہی ایک دوسرا گروہ بھی تھا جسے برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی وہ خدا سے اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہا جو ایمان و اسلام کے شایانِ شان نہیں بلکہ زمانۂ جاہلیت سے مناسبت رکھنے والی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ معاملات کے فیصلے کرنے میں پیغمبرؐ استبداد اور خود رائی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے مشوروں کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ اگر ان کی رائے مان لی جاتی اور مدینہ کے اندر محصور ہو کر جنگ کی جاتی تو یہ افسوسناک صورت پیش نہ آتی کہ ہم یہاں اس ذلت ... کے ساتھ قتل ہوتے۔ ان کی تردید میں فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے اگر تم اپنے گھروں میں بند ہوتے جب بھی جس کو جہاں مرنا تھا وہیں مرتا۔ یہ امور تمہاری تدبیر کے تابع نہیں بلکہ خدا کی مقدر کی ہوئی تقدیر کے تابع ہیں۔ تمہارے اندر چونکہ یہ کمزوریاں موجود تھیں اس وجہ سے اللہ نے چاہا کہ ایسے حالات پیش آئیں کہ تمہاری کمزوریاں ظاہر ہوں، تمہارے دلوں کی جانچ ہو اور تمہارے کھوٹ باہر آئیں۔ اللہ دلوں کے امراض اور ان کے علاج سے اچھی طرح واقف ہے۔

ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعٰن انما استزلھم الشیطٰن ببعض

(صفحہ ۱۵ پر)

مقالات

خالد مسعود

زکوٰۃ کی حقیقت

(۴)

زکوٰۃ ربا کی ضد ہے

کسی شے کی حقیقت تک پہنچنے کا ایک اہم ذریعہ اس کی اضداد کا علم بھی ہے۔ دن کی روشنی کی حقیقت رات کی ظلمت کو دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہے۔ بادِ نسیم کے جانفزا جھونکوں کی قدر وقیمت کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب بادِ سموم کی لپٹیں چہرے کو چھو جائیں۔ گل وگلشن کی نظر نوازی کا راز ایک لق ودق صحرا ہی میں جا کر کھلتا ہے۔ تندرستی کی نعمت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب آدمی خود صاحب فراش ہو جاتا ہے اس بنا پر تعلیم وتعلم کا ایک اصول یہ بھی مانا گیا ہے کہ ایک چیز کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی اضداد کی حقیقت پر غور کیا جائے۔ قرآن مجید چونکہ ذکر ونصیحت کی سب سے زیادہ موزوں کتاب ہے اس لئے اس میں تقابل کے اس اصول کو بہت زیادہ مدّنظر رکھا گیا ہے۔ اس میں جنت کی نعمتوں کے پہلو بہ پہلو دوزخ کی ہولناکیوں کا نظارہ کروایا گیا ہے اور بخل کی رذالت کو ظاہر کرنے کے لئے انفاق فی سبیل اللہ کی فیض رسانیوں کو اجاگر کیا گیا ہے اسی اصول پر قرآن مجید نے زکوٰۃ کو ربا کی ضد کی حیثیت سے پیش کیا ہے جس سے زکوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ فرمایا

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ
وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا
لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا
عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ
تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُضْعِفُوْنَ (روم - ۳۸، ۳۹)

پس قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین و
مسافر کو اس کا حق۔ یہ ان لوگوں کیلئے
بہتر ہے جو خدا کی رضا کے طالب ہیں اور
وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اور جو مال
تم سود پر دیتے ہو، کہ لوگوں کے مالوں میں
بڑھے سو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور جو زکوٰۃ
تم دیتے ہو خدا کی رضا کے طالب بن کر تو ایسے
ہی لوگ اللہ کے ہاں بڑھانے والے ہیں"

اس آیت سے یہ بات تو صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید نے زکوٰۃ کو ربا کی ضد قرار دیا ہے مگر

یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ربا سے مراد کیا ہے۔ اس لفظ کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اس لفظ سے دو چیزوں کو تعبیر کیا ہے۔ ایک سود کو، مثلاً فرمایا

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا — "اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دوگنا چوگنا
الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران[۳]) — کرکے بڑھتا ہوا"

اور دوسرے اس قرض کو جو سود حاصل کرنے کی غرض سے دیا جاتا ہے، جیسا کہ سورۂ روم کی مذکورہ آیت سے واضح ہوتا ہے۔ اس آیت میں 'ربا' کے لفظ کے استعمال کے بارے میں استاذ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کی تصریح حسب ذیل ہے۔ فرماتے ہیں:-

> "آیت میں لفظ 'ربا' استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد میرے نزدیک وہ مال یا قرض ہے جو سود حاصل کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ یہ لفظ کا استعمال اس اسلوب پر ہے جس کو تسمیۃ الشئ بما یئول الیہ سے تعبیر کرتے ہیں یعنی کسی شئ کی تعبیر ایسے نام سے کرنا جو وہ ہونے والی ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے اِنِّیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا (یوسف) اس میں انگور کو شراب سے تعبیر کیا گیا ہے۔"
>
> (میثاق ج ۳ ع ۳ ص۴۲)

یہ متعین کرنے کے بعد کہ ربا سے مراد سودی قرض ہے اور زکوٰۃ اس کی ضد ہے۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ سودی قرضوں کی خصوصیات کیا ہیں جن کے تقابل سے ہم زکوٰۃ کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔

سودی قرض کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مالدار شخص اپنے فاضل سرمایہ یا بچت کو اپنے پاس رکھنے کے بجائے کسی ایسے شخص کو بطور قرض دے دیتا ہے جو اس رقم کا حاجت مند ہوتا ہے۔ قرض دینے والا، یہ قرض بلا معاوضہ دے کر حاجت مند شخص کی ضرورت پورا کرنے کا خواہاں نہیں ہوتا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو ایک خاص شرح سے اس قرض کی اجرت دی جائے۔ اس شرح کا تعین حاجت مند کی حاجت اور اس کی ضرورت کی شدت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ قرض کی یہ اجرت وصول کرتے وقت یہ سوال خارج از بحث ہوتا ہے کہ قرض کی رقم مقروض کے لئے نفع بخش بھی ہوئی یا نہیں اور یہ کہ اس کے معاشی حالات سازگار ہوچکے ہیں یا ابھی تک حسب سابق ناسازگار ہی ہیں۔

رہا یہ سوال کہ قرض پر سود کیوں لیا جاتا ہے اور اس کو قرین انصاف کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے تو اس کے بارے میں مختلف رائیں پیش کی گئی ہیں۔ بعض لوگ اسے ان خدمات کا صلہ قرار دیتے ہیں جو قرض دینے والے کا سرمایہ مقروض کے لئے انجام دیتا ہے۔ بعض معیشت دانوں کے نزدیک چونکہ

قرض دینے والا اپنی نقدی کو دوسرے شخص کی تحویل میں دے دینے کے بعد ان فوائد سے محروم ہو جاتا ہے جو اسے اپنے پاس رکھنے سے حاصل ہو سکتے تھے، اس لئے وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اس قربانی کا بدلہ پائے۔ جدید نقطۂ نظر کے مطابق صرف اتنی بات سود کے جواز کے لئے کافی سمجھی گئی ہے کہ سرمایہ دار قرض دینے کے بعد اپنے مال میں اپنی مرضی سے تصرف کرنے کے حق سے محروم ہو جاتا ہے اور اس بات کا خطرہ بھی موجود ہوتا ہے کہ اگر خود اسے کوئی ضرورت درپیش ہو تو یہ رقم اسے فوراً حاصل نہ ہو سکے۔

اگر قرض دینے والے کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر غور کیا جائے تو سود کے جواز میں کہی گئی مذکورہ باتیں سراسر خلافِ حقیقت نظر آتی ہیں۔ اولاً سرمایہ دار کو اس بات سے دلچسپی کبھی نہیں ہوتی کہ اس کا دیا ہوا سرمایہ مقروض کی کوئی خدمت انجام دے رہا ہے یا نہیں۔ وہ اس بات کی تحقیق نہ معاملہ کرتے وقت کرتا ہے اور نہ اپنی رقم بعد سود وصول کرتے وقت۔ بلکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس کو اصل دلچسپی اپنے سود سے ہوتی ہے خواہ اس کے لئے مقروض کی جائیداد کی قرقی کی نوبت آجائے۔ ثانیاً، یہ بات محل نظر ہے کہ اگر قرض میں دی ہوئی رقم اصل مالک کے پاس ہی رہتی تو وہ اس سے لازماً فوائد ہی سمیٹتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار کے لئے اس بات کا احتمال بھی موجود ہے کہ وہ اپنے حالات یا افتادِ طبع کی بدولت اس سرمائے کو کسی نفع بخش کاروبار میں نہ لگا سکے یا اگر لگائے تو منڈی کے نشیب و فراز کا مقابلہ نہ کر سکے اور نقصان اٹھا کر اپنے اصل زر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ خود اصولِ معاشیات کی رُو سے یہ بات ثابت ہے کہ ایک شخص کسی خاص شرح سود پر قرض دینے پر صرف اسی وقت تیار ہوتا ہے جب وہ اپنے طور پر اس قدر منافع کمانے کا اہل نہیں ہوتا یا بصورتِ دیگر وہ یقینی سود کو غیر یقینی فائدہ پر ترجیح دیتا ہے۔ ثالثاً، قرض دینے والا رقم پر اپنی مرضی کے تصرف سے محروم ضرور ہو جاتا ہے مگر دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ اس کو اس اختیاری محرومی پر آمادہ کرنے والی چیز کون سی تھی۔ سوخوار کی اس محرومی کے پیچھے ایک اور صرف ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور وہ ہے ہوسِ زر۔ اس کے اندر انسانی ہمدردی کے جذبہ کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسے چشمۂ آبِ حیات کا کھوج لگانا۔

اس تفصیل کے بعد اب ہم سود کی بنیادوں کو متعین کر سکتے ہیں اور نظامِ زکوٰۃ کو اس کے مقابل میں رکھ کر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ کا سراپا کیسا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سود خوار شخص اپنا فاضل سرمایہ یا بچت ان مدوں میں لگاتا ہے جہاں سے اس کو معاوضہ کی امید ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے فاضل سرمایہ یا بچت کی رقم معاشرہ کی خدمت میں لگ جاتی ہے اور اس کا فائدہ ہمہ گیر ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سود خوار کا قرض ان حاجت مندوں تک پہنچتا ہے جو صاحب جائیداد ہوں اور جن سے اصل زر بمعہ سود ملنے کی توقع ہو۔ ظاہر ہے کہ اس شرط کے ساتھ سودی کاروبار سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو پہلے سے صاحب حیثیت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس زکوٰۃ معاشرے کے ان گوشوں کو ٹٹولتی ہے جہاں سے حقیقی حاجت مند تلاش کئے جاسکیں۔ اس طرح زکوٰۃ کا فیض زیادہ تر اس طبقے کو پہنچتا ہے جو فی الواقع اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اس کی دستگیری کی جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ سود خوار کے نفس کی تربیت ایسے نہج پر ہوتی ہے کہ نہ وہ خدا کے حق کو پہچانتا ہے اور نہ انسانی ہمدردی اس کے دل میں راہ پاتی ہے۔ اس کی دنیا صرف جمع مال کی کد و کاوش سے عبارت ہوتی ہے۔ تمام پاکیزہ اور بلند جذبے مال کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے جاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے سود خوار کو ناشکرا اور حق تلف کہا ہے۔ سود خوار کے بارے میں فرمایا۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (بقرہ ۲۷۶)

"اور اللہ ہر ناشکرے اور حق تلف کو ناپسند کرتا ہے"

زکوٰۃ دینے والا شخص، جیسا کہ اوپر کے مباحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔ مال کو خدا کی امانت سمجھتا اور اپنی ضروریات سے زائد مال میں سے حاجت مندوں کا حق ادا کرتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مقصد کے لحاظ سے سودی کاروبار کا تانا بانا ہوسِ زر، حرص دینا اور طمع مال سے تیار ہوتا ہے۔ سود خوار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کا مال تجارت کے نشیب و فراز کا سامنا کئے بغیر ان لوگوں کی کارکردگی کی بدولت بڑھے جو اس کے مال کے ذریعے تجارت کرنے نکلے تھے اگرچہ اس کا مال محفوظ مقام پر ہوتا ہے اور قرضداروں کو حالات کے اتار چڑھاؤ کے صدمے برداشت کرنے پڑتے ہیں، تاہم یہ شخص ان کی محنت کے ثمرہ سے گھر بیٹھے بٹھائے اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن نے ... لِيَرْبُوَا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ زکوٰۃ کی قربانی، سود کے برعکس، ہر طرح کے دنیوی مقاصد سے بالاتر ہو کر محض اس امید پر دی جاتی ہے کہ اس کے نتیجہ میں خدا کی رضا حاصل ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ آیت زیر بحث میں یہ بشارت بھی دے دی ہے کہ جو لوگ اعزہ و اقارب، فقراء و مساکین اور حاجت مندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں ان پر خدا کی نظر عنایت ہوتی ہے ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ۔

زکوٰۃ ایک ٹیکس نہیں زکوٰۃ کی حقیقت کے بارے میں یہ سوال متعدد ذہنوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ کیا زکوٰۃ بھی اسی قسم کا ایک ٹیکس ہے جس طرح کے ٹیکس آج کل حکومتیں اپنی

رعایا پر عائد کرتی رہتی ہیں۔ اگرچہ مذکورہ مباحث یہ واضح کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ زکوٰۃ کے حکم کی، ٹیکس سے الگ ایک منفرد حیثیت ہے تاہم اس سوال کی اہمیت کے پیش نظر زکوٰۃ اور ٹیکس کے تفاوت کو مزید کھولنا مفید ہے لہٰذا آئندہ سطور میں ہم مالیات کے ان دو ستونوں کو زیر بحث لائیں گے۔

جدید معاشیات میں ٹیکس کی تعریف یوں کی گئی ہے :-

"ٹیکس سرکاری اداروں کی طرف سے ریاست کے شہریوں پر عائد کردہ وہ واجب الادا رقم ہے جو ان سے ریاست کے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے وصول کی جاتی ہے جو اسے عوام کے مشترکہ فوائد کے لئے برداشت کرنے پڑتے ہیں"

اس تعریف سے ٹیکس کی تین خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں:۔ ایک یہ کہ ٹیکس عائد کرنے کا اختیار سرکاری اداروں کو ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ ٹیکس کی حکومت کو ادائیگی لازمی ہوتی ہے اور تیسری یہ کہ ٹیکس کی رقم ملک کے باشندوں کے اجتماعی مفاد کی خاطر صرف کی جاتی ہے۔ اس لئے یہ آمدنی ریاست کے تمام شعبوں کے اخراجات پورا کرنے کے لئے صرف کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک ٹیکس لگانے کے مقاصد کا تعلق ہے جدید معاشیات کی رو سے یہ تین ہیں۔

پہلا، حکومت کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے رقم مہیا کرنا۔

دوسرا، تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنا، اور

تیسرا، بعض ناروا دلچسپیوں کی ہمت شکنی کرنا (مثلاً منشیات یا جوئے وغیرہ پر ٹیکس)

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے وہ ٹیکس کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں رکھتی، نہ خصوصیات میں اور نہ مقاصد میں۔ بنیادی طور پر زکوٰۃ کسی اسلامی حکومت کے حکم سے عائد نہیں ہوئی بلکہ اس کی فرضیت خود خدائے تعالےٰ کے فرمان کے تحت ہوئی ہے اگر یہ حکم کسی حکومت کے نفاذ کا مرہون منت ہوتا تو آج شائد پوری دنیا میں کوئی شخص بھی اس پر عامل نہ ہوتا۔ یہ حکم ان تمام صورتوں میں ساقط ہو جاتا جن میں کوئی مسلمان کسی غیر اسلامی حکومت کے حدود اختیار میں رہ رہا ہو یا وہ رہتا تو ہو اسلامی حکومت ہی کی حدود میں مگر اس حکومت نے یہ ٹیکس عائد نہ کر رکھا ہو۔ حقیقت میں چونکہ یہ حکم منشائے الٰہی کے مطابق ہے اور اس کو نماز کی طرح اسلام کی علامت قرار دیا گیا ہے، اس لئے مدتہائے دراز سے اسلامی حکومت بالفعل قائم نہ ہونے کے باوجود بھی پوری دنیا کے مسلمان اس حکم کو سینوں سے لگائے ہوتے ہیں اور اس سے گریز کا رجحان اب تک پیدا نہیں ہوا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے حکومت کا وجود شرط نہیں۔ اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہو یا موجود ہو لیکن

وہ لوگوں کو بطور خود تقسیم زکوٰۃ کی اجازت دے دے تو ایک شخص اگر اپنے اہتمام میں زکوٰۃ مستحقین کو ادا کر دیتا ہے تو اس سے زکوٰۃ کا فرض ساقط ہو گیا۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مالوں کی بعض اقسام کی زکوٰۃ بیت المال میں وصول کرنے کے بجائے لوگوں کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ خود مستحقین کے حوالے کر دیں۔ ٹیکس کے معاملے میں، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، حکومت کو ادائیگی شرط ضروری ہے۔

زکوٰۃ کو ٹیکس سے ممیز کرنے والی تیسری چیز اس کے مخصوص مصارف ہیں جو قرآن نے متعین کر دیئے ہیں۔ ان میں حاجت مندوں کی حاجت روائی کا پہلو سرفہرست ہے جس سے کسی حال میں صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر قرآن کی متعین کی ہوئی یہ مدات نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں اور آدمی اپنی صوابدید کے مطابق زکوٰۃ کی رقم کو صرف کرنے لگے تو فقہ اسلامی کی رو سے اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔

مقاصد کے نقطہ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس پہلو سے بھی زکوٰۃ ٹیکس سے مختلف مزاج رکھتی ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد نعمت مال کے حصول پر خدا کا شکر ادا کرنا ہے اور اس کے ضمنی مقاصد میں جو چیزیں شمار کی جا سکتی ہیں وہ ہیں تزکیۂ نفس اور حاجت مندوں کی امداد۔ اس کے بالمقابل ٹیکس کا بنیادی مقصد حکومت کے اخراجات کے لئے رقم مہیا کرنا ہے۔ اس اعتبار سے گویا زکوٰۃ ادا کرنے والے کا عندیہ ہی ٹیکس دینے والے سے مختلف ہوتا ہے۔

زکوٰۃ ایک مالدار مسلمان پر واجب ہوتی ہے اور اس کی وجہ اس کا مسلمان ہونا اور غنی ہونا ہے۔ اگر یہ دونوں خصوصیات کسی شخص میں موجود نہ ہوں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔ اس کے برعکس ٹیکس کسی حکومت کا شہری ہونے کی بنا پر عائد ہوتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

یہ حقیقت کہ زکوٰۃ حاجت مندوں کا ایک حق ہے اس کو ٹیکسوں سے اعلیٰ و ارفع ایک حیثیت عطا کر دیتی ہے۔ زکوٰۃ نہ دینے والا شخص محتاجوں کے مال کا غاصب قرار پاتا ہے اور اس کا پورا مال ناپاک متصور ہوتا ہے۔ ٹیکسوں کے باب میں اس طرح کا نقطۂ نظر نہ صرف ناپید ہے بلکہ اسے پیدا کرنا بھی ناممکن ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کو معروف معنوں میں ٹیکس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ نہ صرف حقیقت سے انحراف ہو گا، بلکہ یہ چیز زکوٰۃ کے بلند مرتبہ کو گھٹانے کے مترادف ہو گی۔

یہیں سے ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کو ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان پر سے زکوٰۃ ساقط ہو جانی چاہیئے۔ ایک چیز دوسری چیز کا بدل اسی صورت میں قرار پا سکتی

"تحریک جماعت اسلامی" (۲)

اسرار احمدؒ

نقضِ غزل[1]

(۳)

بعض مصروفیات کی بنا پر گذشتہ شمارے میں "نقضِ غزل" کی قسط شامل اشاعت نہیں کی جا سکی تھی، اس شمارے سے یہ سلسلہ پھر شروع کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلۂ مضامین کے ضمن میں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس میں جن واقعات کا تذکرہ ہو رہا ہے اور جماعت اسلامی کی تاریخ کے جس اہم مگر مخفی باب اور اس کی "روداد" کے جس ضروری مگر غیر مطبوعہ "حصے" کو پیش کیا جا رہا ہے ــــ اور خاص طور پر واقعات و حوادث کی جو توجیہ پیش کی جا رہی ہے وہ راقم الحروف کا ذاتی نقطۂ نظر ہے ــــ اسے کسی گروہ یا بہت سے افراد کی متفقہ ترجمانی نہ سمجھا جائے ــــــــ (اسرار احمدؒ)

ارکانِ جائزہ کمیٹی پر الزام نامے کے جواب میں مولانا مودودی کے نام مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا یہ خط[2] ــــــ جسے بعد میں ایک موقع پر پاکستان میں شام کے سابق سفیر جناب عمر بہاء الامیری نے اس شکوے کے باوجود کہ "فیہ بعض الخشونۃ" (اس میں قدرے درشتی پائی جاتی ہے!) ایک قاضی کا فیصلہ قرار دیا اور مولانا اصلاحی کو مخاطب کر کے اعتراف کیا کہ "قد کتبت ھٰذا الکتاب کما یکتب القاضی قضاءہٗ" (آپ نے یہ خط بالکل ایسے لکھا ہے جیسے ایک قاضی اپنا فیصلہ لکھتا ہے!) ــــــــ

---

[1] وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ۝
"اس عورت کی مانند نہ ہو جاؤ۔ جس نے محنت و مشقت سے کاتتے ہوئے سوت کو خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔"

[2] جو "میثاق" ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں من و عن شائع کیا جا چکا ہے!

—— جماعت اسلامی کے ان دو چوٹی کے قائدین کے آپس کے تعلقات اور سترہ سالہ رفاقت کے اختتام کی تمہید بن گیا، اور اس خط کے ذریعے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے گویا مولانا مودودی پر عدم اعتماد کا تحریری اظہار کر دیا!

یہ چونکہ جماعت کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم واقعہ ہے —— لہٰذا ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اس کے لیئے ان دونوں حضرات کے تعلقات کے تاریخی پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنا بہت مفید ہے۔

۱۹۴۱ء میں جب جماعت اسلامی قائم ہوئی تو اس وقت جو لوگ مولانا مودودی کی دعوت پر جمع ہوئے ان میں اخلاص، تقویٰ اور للٰہیت کے اعتبار سے تو ہو سکتا ہے کہ کچھ دوسرے لوگ بہت آگے ہوں لیکن مشہور عالم دین اور معروف اہل قلم ہونے کے اعتبار سے متحدہ ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیتوں میں سے مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنؤ اور مولانا امین احسن اصلاحی مدیر "الاصلاح" سرائے میر اعظم گڑھ کے نام صف اول میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے دو مشہور و معروف تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم صف ثانی میں سے قابل ذکر ہیں ——
—— مولانا مودودی، مولانا نعمانی اور مولانا اصلاحی نہ صرف یہ کہ عمر کے اعتبار سے تقریباً برابر تھے بلکہ علمی و صحافتی زندگی کے اعتبار سے بھی تقریباً ہم سن تھے۔ مولانا مودودی کا 'ترجمان القرآن'، مولانا نعمانی کا 'الفرقان'، اور مولانا اصلاحی کا 'الاصلاح' —— ان تینوں پرچوں کی اشاعت تقریباً ایک ہی وقت شروع ہوئی —— ان 'اصحاب ثلاثہ' میں سے مولانا محمد منظور نعمانی پر دینی تعلیم کے قدیم سلسلے سے گہرے تعلق اور اصحاب تقویٰ و احسان سے قریبی روابط کی بنا پر علم دین کے ساتھ تقویٰ کا رنگ غالب تھا، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مولانا حمید الدین فراہی کے تلمیذ رشید ہونے کی بنا پر فہم قرآن میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے —— اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جدید نظریات و افکار کے وسیع مطالعے اور نظام دین پر ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے خصوصی نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک عام فہم، دل نشین اور شگفتہ طرز تحریر کے مالک ہونے کی وجہ سے جدید علم کلام میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

جس زمانے میں مولانا مودودی متحدہ قومیت کے نظریئے اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے موقف پر شدید تنقید کے ضمن میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے "مسلم قوم پرستی" کے انتہائی مقام تک پہنچ گئے تھے، ایک بار 'الاصلاح' اور 'ترجمان القرآن' میں شدید ٹکراؤ بھی پیدا ہوا اور مولانا مودودی کے موقف پر مولانا اصلاحی نے اس اعتبار سے شدید تنقید کی کہ مسلم قوم پرستی

فی نفسہٖ اسلام کے موقف کی صحیح ترجمانی نہیں ہے لیکن جب مولانا مودودی نے اپنے نقطۂ نظر کو تبدیل کرلیا اور خالص اسلامی نقطۂ نظر کے تحت وہ مضامین لکھے جو ان کی کتاب "سیاسی کشمکش" کے حصۂ سوم میں شامل ہیں تو مولانا اصلاحی نے ان کے نقطۂ نظر کی صحت کو تسلیم کرلیا؛ اور اس طرح ان حضرات کے مابین تعاون اور اتحاد کی راہ ہموار ہوئی[1]

علمی وصحافتی تعارف سے قطع نظر مولانا مودودی سے ملاقات اور براہِ راست ربط وتعلق کا موقع مولانا نعمانی کو مولانا اصلاحی سے پہلے ملا —— اور جب مولانا مودودی نے خالص اسلامی نصب العین پیش کرکے 'جماعتِ اسلامی' کے قیام کی دعوت دی تو مولانا نعمانی ہی نے مولانا اصلاحی کو مولانا مودودی کے بارے میں یہ اطمینان دلایا کہ اگرچہ ان کی شخصیت اس معیار پر تو پوری نہیں اترتی جو اقامتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جھنڈا اٹھانے والوں کے لئے لازمی ہے —— تاہم مولانا مودودی ایک "کام چلاؤ" آدمی بہرحال ہیں اور ان کے ساتھ تعاون واشتراک کیا جانا چاہیئے۔ مولانا نعمانی کی اس رائے کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کی نشاندہی خود انہوں نے اپنے ایک حالیہ مکتوب میں ان الفاظ میں کی ہے:

"اسلام کی سربلندی کا نصب العین زیادہ چھان پھٹک اور کھوج کرید کرنے نہیں دیتا تھا....."

مولانا اصلاحی صاحب کی مودودی صاحب سے پہلی ملاقات جماعت میں شمولیت کے اعلان کے بعد ہوئی اور مولانا نعمانی صاحب کی رائے کے برعکس مولانا اصلاحی صاحب کی جو رائے مولانا مودودی

---

[1] اس موقع پر "تحریک جماعت اسلامی" کے حصۂ اول کے دیباچے کے یہ الفاظ ذہن میں تازہ کرلئے جائیں۔

"لیکن یہ بہرحال ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جماعتِ اسلامی کا قیام ان نظریات کی اساس پر نہیں ہوا جو مولانا مودودی نے سیاسی کشمکش کے پہلے اور دوسرے حصوں میں بیان فرمائے ہیں بلکہ ان پر ہوا ہے کہ جو اس کے تیسرے حصے میں مفصل و مدلل بیان ہوئے —— ان نظریات کو اساس بنا کر مولانا نے ۱۹۴۱ء میں ایک اسلامی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی جس کو قبول کرنے والوں میں وہ بھی تھے جو مولانا مودودی کے پہلے سیاسی موقف سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور اس پر شدید تنقید بھی کرچکے تھے۔

لہٰذا "تحریک جماعت اسلامی" کی ابتدا زیادہ سے زیادہ ۳۹-۱۹۳۸ء سے شمار کی جاسکتی ہے اس تحریک کے داعی یقیناً مولانا مودودی ہی ہیں لیکن ان کی جس دعوت پر جماعتِ اسلامی قائم ہوئی وہ سیاسی کشمکش حصص اول و دوم کی نہیں بلکہ صرف حصہ سوم کی ہے" صفحہ ۳

کے بارے میں قائم ہوئی اس کا اظہار انہوں نے انہی دنوں مولانا نعمانی سے ایک نجی گفتگو میں بایں الفاظ کیا کہ —— " لا فرق بینہ و بین پرویز " (ان کے اور پرویز صاحب کے مابین کوئی فرق نہیں ہے!)
اس کے باوجود مولانا اصلاحی صاحب کا جماعت میں شامل رہنا اس بنا پر تھا کہ ان کے نزدیک وہ مقصد اور نصب العین جس کے لیے کام کرنے کی دعوت مولانا مودودی صاحب نے دی تھی بہر حال بالکل صحیح تھا، اور دین کے اصل تقاضے اسی طریقے پر کام کرنے سے ادا ہو سکتے تھے جس طریقے پر کام کرنے کی دعوت مولانا مودودی نے دی تھی!
متذکرہ بالا پس منظر میں جو اجتماعیت قائم ہوئی —— اس کا ایک پہلو تو یہ ظاہر ہے کہ اس میں داعی کی قوت جذب و کشش سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے برابر دخل جمع ہونے والوں کے ذوق انجذاب کو حاصل تھا —— اور دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دوسری قدیم یا ہم عصر دینی جماعتوں اور تحریکوں کے برعکس 'جماعتِ اسلامی' کی اجتماعیت کی اساس و بنیاد کوئی 'شخصیت' نہ تھی، بلکہ نصب العین اور مقاصد تھے —— یہی وجہ ہے کہ اول روز ہی سے اس میں دستور اور قواعد و ضوابط کو بنیادی اہمیت حاصل رہی![1]

جماعت کے قیام کے بعد جب 'دارالاسلام' میں قرب میسر آیا اور ایک دوسرے کو قریب

---

[1] یہاں مذکورۃ الصدر دیباچے کے یہ الفاظ لائق توجہ ہیں:-

" مولانا مودودی صاحب کو یقیناً اس کا حق ہے کہ اپنے ذہنی ارتقاء کے مختلف منازل اور اس سفر کے دوران لیے گئے موڑوں (TURNS) کی تاریخ بیان فرماتے ہوئے ابتداء جہاں سے چاہیں کریں لیکن جماعتِ اسلامی کی تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کی ابتدا اس طرز پر کرنا صرف اس صورت میں درست ہو سکتا تھا کہ "جماعت اسلامی" کچھ لوگوں کے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر "بیعت" کرنے سے معرض وجود میں آئی ہوتی۔ اس صورت میں کسی دستور کا مرتب ہونا اور امیر جماعت کا منتخب کیا جانا بے معنی ہوتا" (صفحہ ۱۲)

" چنانچہ جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے یہ جماعت اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ کچھ لوگوں نے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہو بلکہ اس کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ کچھ لوگوں نے ایک نصب العین کے بعد، اس کی ایک مخصوص تشریح اور ایک مکمل دستور کے ساتھ وفاداری کا رشتہ استوار کیا اور پھر انہوں نے اپنے میں سے ایک امیر اور اس کی ایک مجلس شوریٰ منتخب کی اور ان کے مابین اختیارات کی حدود کو متعین کر دیا" (صفحہ ۱۴)

سے دیکھنے کے مواقع ملے تو جلد ہی مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور دوسرے بہت سے حضرات نے یہ محسوس کیا کہ مولانا مودودی کی شخصیت کے بارے میں ان کے پہلے اندازے بھی بہت مبالغے پر مبنی تھے اور یہ کہ ان کی شخصیت کو اس کام سے سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے جسے لیکر وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، چنانچہ اپنے قیام کے ایک ڈیڑھ سال کے اندر اندر جماعت اسلامی اپنے پہلے بحران سے دوچار ہوگئی ـــ اور مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا جعفر پھلواروی اور دیگر بہت سی اہم اور معروف شخصیتوں سمیت جماعت اسلامی کے کل ارکان کی تقریباً ایک تہائی تعداد جماعت سے علیحدہ ہوگئی۔

اس موقع پر جو دو باتیں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ان حضرات سے کہیں وہ بعد کے پیش آمدہ واقعات کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں:-

ایک یہ کہ آپ حضرات چونکہ خود تدین و تقوےٰ کے اعتبار سے بلند مقامات پر فائز ہیں لہٰذا آپ کے لیے جائز ہے کہ آپ مودودی صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر تنقید کریں، جو تقویٰ کے منافی ہیں ـــ لیکن میں چونکہ اس اعتبار سے خود تقریباً مولانا مودودی ہی کی سطح کا آدمی ہوں لہٰذا اس معاملے میں زبان طعن نہیں کھول سکتا!

دوسرے یہ کہ میں اگر جماعت میں شامل نہ ہوا ہوتا تو دوسری بات تھی لیکن اب جب کہ میں جماعت اسلامی میں شامل ہو چکا ہوں تو اس سے علیحدگی کو معمولی بات نہیں سمجھتا، میرے نزدیک اب صحیح صورت یہ ہے کہ اصلاح احوال کی مقدور بھر کوشش کی جائے لہٰذا میں جماعت میں شامل رہ کر اس بات کی سعی کرتا رہوں گا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی اصلاح کرتے اور ایک دوسرے کی خامیوں کی تلافی کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں اور دین کی خدمت کی کوشش کریں۔

متذکرہ بالا بحران اور علیحدگیوں کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی جماعت کی صف اول میں مولانا مودودی کے ساتھ تنہا رہ جانے کی بنا پر جماعت کی تنظیم میں واضح طور پر شخص نمبر دو بن گئے ـــ اول تو یہی بات کہ ایک شخص کسی جماعت میں واضح طور پر شخصِ دوم بن جائے اس کی پوزیشن کو نازک بنا دینے کے لیے کافی ہے ـــ پھر جب صورت حال یہ ہو کہ مزاج اور نقطہ نظر کے اعتبار سے اس کے اور امیر کے مابین نمایاں فرق موجود ہو اور وہ اپنے ذمے یہ کٹھن خدمت بھی لے لے کہ اسے مقاصد اور نصب العین سے تعلقِ خاطر کی بنا پر نہ صرف اس کے ساتھ نباہ کرنا ہے بلکہ اس کی خامیوں اور کمیوں کی تلافی بھی کرنی ہے تو صورتِ حال اور بھی نازک ہو جاتی ہے ـــ لیکن یہ حقیقت ہے

اور اس سے شاید ہی کوئی شخص انکار کی جرأت کر سکے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے اس نازک اور کٹھن ذمہ داری کو کمالِ ہمت و تحمل کے ساتھ مسلسل سولہ سترہ سال نبھایا۔

اس پورے عرصے میں مولانا امین احسن اصلاحی مولانا مودودی کے دست راست رہے، اور پوری تن دہی اور انہماک کے ساتھ نہ صرف اس نصب العین کی خدمت میں لگے رہے جس کی خاطر جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی تھی، بلکہ جماعت کے اندر یا اس کے باہر کے حلقوں سے جب بھی کوئی حملہ مولانا مودودی کی ذات پر ہوا تو اس کی مدافعت میں بھی ہمیشہ مولانا امین احسن اصلاحی ہی سینہ سپر ہوتے حتیٰ کہ اس سلسلے میں انہیں اپنے دیرینہ دوستوں اور رفیقوں ہی کی نہیں بلکہ اپنے بزرگوں اور ممدوحوں و مخدوموں تک کی کبیدگیٔ خاطر برداشت کرنی پڑی۔

تقسیم ہند سے قبل یعنی جماعت اسلامی کے دورِ اوّل میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے تحریکِ اسلامی کی جو سب سے بڑی خدمت سرانجام دی وہ یہ تھی کہ اس تحریک کے اصول و مبادی اور اس کے طریقِ کار کے بعض انتہائی اہم پہلوؤں اور اس کی جدوجہد کے نمایاں مراحل کو براہِ راست قرآن حکیم کی روشنی میں واضح اور مستحکم اساس پر مرتّب و مدوّن کیا ـــ جس کے نتیجے میں "دعوت دین اور اس کا طریق کار" جیسی بلند پایہ اور مایۂ ناز کتاب منصّۂ شہود پر آئی۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اسی کتاب کے اثر سے جماعت اسلامی کے لٹریچر میں مولانا مودودی صاحب کی بعض اہم اور بنیادی مگر سطحی اصطلاحات جیسے حکومت الٰہیہ کا قیام وغیرہ کا استعمال متروک ہوا، اور ان کی جگہ شہادتِ حق، اور اقامتِ دین کی قرآنی اصطلاحات رائج ہوئیں اور فی الجملہ جماعت کی تحریک پر دینی رنگ زیادہ گہرا ہوا، ـــ جماعت کی تقسیم ہند سے پہلے تک کی 'رودادوں' کے مطالعے سے دوسری حقیقت جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جماعتی زندگی کے مقتضیات اور اسلامی نظم جماعت کے اصول و فروع اور خدوخال کی وضاحت کے معاملے میں بھی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اہم کردار ادا کیا۔[۱]

---

[۱] یہی بات ہے جو "تحریک جماعت اسلامی" کے دیباچے میں اس طرح بیان ہوئی کہ۔

"رہے ان کے (مولانا مودودی کے) مخصوص "کلامی نظریات" اور ان کا خاص تصوّرِ دین و تحریکِ اسلامی تو جہاں یہ واقعہ ہے کہ وہ اوّلاً بھی جماعت کی اساس میں موجود تھے اور بعد میں بھی ہمیشہ اس کی رگ و پے میں سرایت کرتے رہے وہاں یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کچھ اور اہل قلم کی تحریروں نے بھی جماعت اسلامی کے تصورِ دین اور تحریکِ اسلامی کے خطوط اور نقوش مرتب کرنے میں اہم حصہ ادا کیا اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف تو اس معاملے میں انتہائی مؤثر ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ یہ حقیقت ہے کہ جماعت کی تشکیل کے بعد اسکے تحریکی لٹریچر میں مولانا اصلاحی صاحب کی تحریروں کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے"! صفحہ ۱۳

اس تعاضد و تناصر کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر ایک معاملے میں مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کے مابین اختلاف بھی رہا —— یہ معاملہ اسلامی نظام جماعت میں امیر کے اختیارات سے متعلق تھا - مولانا مودودی بحیثیتِ امیرِ جماعتِ اسلامی اپنے لئے غیر محدود اختیارات کے طلب گار تھے۔ ان کے نزدیک شوریٰ کا مقام صرف یہ تھا کہ امیر کو اپنے مشورے سے مطلع کر دے اس کے مشورے کو قبول یا ردّ کر دینے کا مکمل اختیار امیر کو حاصل تھا گویا جدید اصطلاح میں مولانا مودودی کے نزدیک جماعتِ اسلامی کے امیر کو شوریٰ پر 'ویٹو' کا حق حاصل تھا —— اس کے برعکس مولانا اصلاحی شدت کے ساتھ اس رائے کے حامل تھے کہ اسلامی نظم جماعت میں امیر کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیئے یہ ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں مولانا اصلاحی صاحب کے پیشِ نظر اس مسئلے کے خالص علمی (ACADEMIC) پہلوؤں کے علاوہ خاص طور پر جماعت اسلامی کے مخصوص حالات بھی ہوں، بہرحال مولانا اصلاحی صاحب ابتدا ہی سے اس معاملے میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرتے رہے —— حتیٰ کہ تقسیم ہند سے متصلاً قبل الہ آباد کے کل ہند اجتماع کے موقع پر منعقدہ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں اس مسئلے پر خاصی تلخی بھی ہوئی —— تاہم تقسیم ہند سے قبل تک چونکہ جماعت کا فعّال دور شروع ہی نہیں ہوا تھا لہٰذا اس معاملے کی اہمیت بھی زیادہ تر علمی (ACADEMIC) ہی رہی!

تقسیم ہند کے بعد بھی مسلسل نو دس برس تک مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی مزاج کے شدید اختلاف کے باوجود یک جان دو قالب ہو کر ساتھ کام کرتے رہے —— اور پاکستان کے عوام اور جماعت اسلامی کے ارکان تو کجا خود مرکزی مجلس شوریٰ کے زیادہ سے زیادہ ایک دو آدمیوں کے سوا کسی کو کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوا کہ ان دونوں حضرات کے مابین کسی معاملے میں کوئی قابلِ ذکر اختلاف موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا انتہائی ایثار تھا کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو بالکلیہ مولانا مودودی کی شخصیت میں ضم ہی نہیں گم کر دیا اور اس معاملے میں انہوں نے صرف اپنے دیرینہ رفقاء اور بزرگوں کے طعنے ہی برداشت نہیں کئے بلکہ اغیار کی پھبتیاں تک سہیں کسی نے انہیں مولانا مودودی کا انجلز قرار دیا —— اور کسی نے حکیم نورالدین! بہرصورت انہوں نے کبھی مولانا مودودی کے رجل ثانی (SECOND MAN) قرار دیئے جانے میں عار محسوس نہ کیا——

اوپر امیر اور شوریٰ کے مابین اختیارات کی تقسیم کے سلسلے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نقطۂ نظر کے جس اختلاف کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالآخر اس طرح طے ہوا کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کے دستور میں امیر اور شوریٰ کے اختلاف کی صورت میں جماعت کے عام ارکان سے استصواب کی راہ نمی

طور پر متعین کر دی گئی اور طے کر دیا گیا کہ اگر جماعت کے ارکان کی اکثریت امیر کی رائے پر عدم اعتماد کر دے تو شوریٰ خود بخود معزول ہو جائے گی اور نئی شوریٰ منتخب ہو گی۔ بصورت دیگر امیر معزول ہو جائے گا اور نئے امیر کا انتخاب ہو گا! ـــــ لیکن اس سے اس کے سوا اور کچھ نہ ہوا کہ نظری اعتبار سے جماعتِ اسلامی کے دستور میں امیر کے ساتھ شوریٰ کو بھی اہم اور مستقل بالذات حیثیت حاصل ہو گئی اور ان کے مابین نزاع کی صورت میں تصفیے کی ایک راہ متعین ہو گئی لیکن عملاً جماعت اسلامی پاکستان میں شورائیت بطور ایک نظام (INSTITUTION) کبھی رائج نہ ہو سکی۔ آزادی کے فوراً بعد جماعت اپنے فعال دور میں داخل ہو گئی اور اس میں کچھ تو حالات اور واقعات کی رفتار اس قدر تیز رہی کہ ایک قسم کی ہنگامی صورتِ حال ہر وقت طاری رہی جس میں مشاورت کے امکانات خود بخود ہی کم ہو جاتے ہیں ـــــ اور کچھ مولانا مودودی نے مسلسل یہ طرزِ عمل اختیار کئے رکھا کہ ہر اہم فیصلہ خود کر لیتے اور اس کے تحت آئندہ کے لئے عملی اقدام کی ابتدا بھی ـــــ کسی جلسہ عام کی تقریر یا اخباری بیان میں کر ڈالتے ـــــ اس کے بعد جب شوریٰ کا اجلاس ہوتا تو وہ غریب اس صورتِ حال سے دوچار ہو جاتی کہ ایک اقدام کیا جا چکا ہے اور اب جماعت کا وقار اور اس کے امیر کی عزت (PRESTIGE) صرف اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ جماعت اس لائحہ عمل (LINE OF ACTION) کو اختیار کر لے!

پاکستان میں جماعت اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا ـــــ اور اس کے جو نتائج برآمد ہوتے ان سب پر ایک سیر حاصل بحث "تحریک جماعت اسلامی" کے حصہ اول میں کی جا چکی ہے لیکن موضوع زیرِ بحث کا تقاضا ہے کہ اس کے چند مزید گوشوں کو روشنی میں لایا جائے!

پاکستان میں جماعت کے کام کی تیز رفتاری اور اس کے تیزی کے ساتھ وسعت پذیر ہونے کے یہ نتائج تو ظاہر ہی ہیں کہ نہ نئی بھرتی کے لئے سابقہ معیار قائم رکھا جا سکا اور نہ نئے آنے والوں کے لئے تربیت کا خاطر خواہ اہتمام ہو سکا ـــــ لیکن عواقب کے اعتبار سے اس کا سب سے زیادہ خطرناک نتیجہ جو برآمد ہوا وہ یہ تھا کہ نووارد اور ہر اعتبار سے خام مگر 'تیز' کارکنوں کو 'تیزی' کے ساتھ جماعت میں آگے بڑھنے کے مواقع مل گئے۔ اول تو جو لوگ جماعت کے اس 'سیاسی دور' میں جماعت میں شامل ہوتے ان کے ذہن کی ساخت اور مزاج کی افتاد میں فطری طور پر شروع ہی سے 'سیاسیت' کا رنگ غالب تھا' ـــــ پھر تیزی سے بڑھتی ہوئی ضروریات کے تحت جب جماعت کی CIVIL SERVICE توسیع پذیر ہوئی تو اس میں ایک فطری ضرورت کے تحت وہ لوگ کھپائے گئے جو جماعت سے تعلق کی بنا پر سرکاری ملازمتوں سے علیٰحدہ کئے گئے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ بلا استثناء علم

دین سے بالکل کورے تھے اور بقول شخصے صرف تفہیمات اور تنقیحات کے 'فارغ التحصیل' تھے۔ حد یہ ہے کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد نے جماعت کے تمام لٹریچر کو بھی بالاستیعاب نہ پڑھا تھا ——— اور ان کے بڑے بڑوں کے لئے بھی مولانا اصلاحی صاحب کی تحریریں تو بہت 'مشکل' اور 'روکھی' تھیں ہی! ——— ——— جماعت کے حالیہ طریق کار کے پیش نظر جو سب سے بڑا وصف ان لوگوں میں تلاش کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ وہ تقریر کر سکیں، اچھے منتظم ہوں اور دفتری و تنظیمی ذمہ داریوں کو باقاعدگی اور نفاست کے ساتھ ادا کر سکیں یعنی یہ کہ فی الجملہ "تیز کارکن" ہوں ——— چنانچہ ان میں سے جو جتنا 'تیز' ثابت ہوا، اسی قدر تیزی کے ساتھ مقامی اور ضلعی جماعتوں کی قیّمیت سے ہوتا ہوا قیم حلقہ کے مقام تک جا پہنچا ——— اور دیکھتے ہی دیکھتے جماعت کی پوری مشینری پر ان حضرات کا مکمل تسلط ہو گیا۔

اہلِ علم، جماعت میں اوّل تو پہلے ہی کم تھے ——— پھر ان کی بھی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں رہ گئی ——— اور پاکستان کی جماعت کے حصے میں جو آئے وہ رفتہ رفتہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے چلے گئے رہے دینی مزاج رکھنے والے متدین اور سنجیدہ و متین لوگ تو ان کا کچھ عرصے تک تو احترام کیا جاتا رہا اور بعض ذیلی امارتوں پر ایسے حضرات فائز رہے لیکن رفتہ رفتہ یہ منصب بھی ان "بُڈھے اور سست" لوگوں سے چھین کر 'مستعد کارکنوں' کے حوالے کر دیئے گئے ——— حتیٰ کہ حلقوں کی امارت پر بھی یہی 'کارکن' لوگ قابض ہو گئے! ——— اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ یہی لوگ مولانا مودودی کے اصل دست و بازو اور جماعت اسلامی کی اصل قوت و طاقت بن گئے ——— اور اہلِ علم اور متدین مزاج لوگ پیچھے ہٹتے اور گوشوں میں سمٹتے چلے گئے ——— لے دے کر صرف ایک خیریت رہی اور وہ یہ کہ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ میں خصوصاً غیر علاقائی نشستوں پر بالعموم اہلِ علم اور متدین لوگ ہی منتخب ہوتے رہے اور اس میں آخر وقت تک ایسے حضرات کو ایک مؤثر حیثیت حاصل رہی اور اگرچہ ان وجوہات کی بنا پر جو اوپر بیان ہو چکی ہیں یہ لوگ جماعت کی مجموعی پالیسی پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکے تاہم اتنا ضرور رہا کہ مرکزی مجلس شوریٰ میں 'کارکن' حضرات کو زیادہ سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا اور علم اور اہلِ علم کا ایک وقار اور دبدبہ اس طرح قائم رہا کہ نئے نئے فلسفے اور نظریات اور تازہ رجحانات جو جماعت کے اس فعّال عنصر میں پیدا ہوتے وہ اگرچہ عملاً جماعت کی رگ و پے میں سرایت کرتے رہے تاہم شوریٰ میں کبھی بار نہ پا سکے بلکہ شوریٰ میں بالعموم ان پر نکیر ہی ہوتی رہی!

ان نئے نظریات میں سب سے زیادہ خطرناک نظریہ یہ تھا کہ تحریکیں مجرد اصولوں کے بل پر نہیں چلا کرتیں بلکہ شخصیتوں کے بل پر چلا کرتی ہیں لہٰذا جماعت اسلامی کی کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت

کو ابھار کر سامنے لایا جائے۔ اس خیال نے خاص طور پر اس وقت بہت زور پکڑا جب ۱۹۵۱ء میں سابق صوبہ پنجاب میں جماعت کو انتخابات میں بری طرح شکست ہوئی اور کارکن، حضرات کے حوصلوں اور امنگوں کو زبردست دھکا لگا۔ اس وقت جہاں ایک طرف یہ سوچا گیا کہ ٹھیٹھ اصول پرستی کو ترک کر کے عوام میں مقبولیت کے لیے کچھ نعرے (SLOGANS) اختیار کئے جائیں۔ وہاں ایک دوسری راہ یہ تجویز ہوئی کہ مولانا مودودی کو جلد از جلد پاکستان کا 'قائدِ اعظم' بنا دیا جائے —— بدقسمتی سے پاکستان کے ابتدائی چند سالوں میں جماعت اسلامی کی "مطالبے" کی مہموں اور ان کے خصوصی تکنیک نے ملک کی فضا میں ایک وقتی اور عارضی سا تہلکہ واقعتہً مچا دیا تھا اور اسی ضمن میں خاص طور پر کراچی کے چند جلسوں میں مولانا مودودی کو بڑی بھاری تعداد میں سامعین نے سنا تھا۔ اس بنا پر اس کا امکان محسوس کیا گیا کہ "پیراں نمے پرند، مریداں می پرانند" کے اصول پر کام کیا جاتے تو بہت جلد مولانا مودودی کو پاکستان کا قومی رہنما اور ہیرو بنایا جا سکتا ہے —— چنانچہ ایک طرف جماعت کے ادیبوں اور انشا پردازوں نے مولانا مودودی کی ذات کے مختلف پہلوؤں کو عظمت اور تقدس کے خوش نما رنگوں میں سجا کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا اور دوسری طرف استقبالوں، جلوسوں، استقبالیہ دعوتوں، سپاسناموں اور نذرانے کی تھیلیوں کے ذریعے کم سے کم ایک بار تو انہیں ایک مکمل قومی لیڈر کے روپ میں پیش کر ہی دیا گیا۔

جماعت میں اس نئے رجحان نے پرانے سنجیدہ اور متدین لوگوں کو سخت پریشان کر دیا اور ان کی جانب سے اس قسم کی سرگرمیوں پر ناپسندیدگی کا اظہار ہونا شروع ہوا، لیکن اول تو اس مہم کی سرکردگی مرکز کے فعال عناصر کر رہے تھے اور دوسرے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں ان حضرات کو مولانا مودودی کی مکمل تائید نہیں تو کم از کم اشیرواد ضرور حاصل تھی، مولانا مسعود عالم مرحوم نے خود مولانا مودودی کی ذات میں اس رجحان کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور یہ بات انہیں جس قدر ناپسند تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے شعبے (دار العروبہ) کو جماعت کے مرکز سے دور ہی رکھا۔ مولانا عبد الغفار حسن صاحب نے ایک بار ان سے اس معاملے میں استفسار کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ مرکز سے دور ہی رہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا۔

"مولانا مودودی چاہتے ہیں کہ میں دار العروبہ کے ذریعے عرب ممالک میں ان کی ذات کا پروپیگنڈا کروں لیکن جب تک میں دار العروبہ میں موجود ہوں انشاء اللہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی!"

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس رجحان کی مزاحمت ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی اور مولانا امین احسن

اصلاحی صاحب کے سوا جماعت میں اور کسی شخص کو یہ مقام حاصل نہیں تھا کہ وہ اس فتنے کی سرکوبی کر سکے چنانچہ یہ ناخوشگوار فرض انہی کو انجام دینا پڑا اور وقتاً فوقتاً جب بھی اس نظریئے نے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ میں سر اٹھایا انہوں نے اس کی سختی سے مذمت کی اور بارہا ایسا ہوا کہ انہیں اس نظریئے کے علمبرداروں کو درشتی سے ڈانٹ دینا پڑا — ! اور یہ بات مولانا مودودی کے معتقدین کے نزدیک اس امر کا کافی ثبوت بن گئی کہ مولانا اصلاحی مولانا مودودی کی بڑھتی ہوئی شہرت اور روز افزوں مقبولیت کی بنا پر ان سے حسد کرنے لگے ہیں !

ان حقائق کو پس منظر میں رکھ کر ان واقعات پر غور کیا جائے جو جائزہ کمیٹی اور اس کی رپورٹ کے بعد پیش آئے تب صورتِ حال کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں جبکہ جماعت کو پاکستان میں ایک خاص نہج پر کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے، جماعت کے عام ارکان کی جانب سے جماعت کی پالیسی اور طریق کار — اور خصوصاً اس کے دینی و اخلاقی انحطاط کے بارے میں تشویش کا ایک عام اور پرزور اظہار ہوا، اس وقت تو مولانا مودودی نے غالباً بربنائے 'حکمت' اس عام بے چینی اور بے اطمینانی کا مواجہہ کرنے کی بجائے جائزہ کمیٹی کے تقرر کو غنیمت سمجھا لیکن بعد میں یہی جائزہ کمیٹی ان کے گلے کا ہار بن کر رہ گئی ! — جماعت کے مرکز کے 'فعّال' اور 'کارکن' عنصر نے جائزہ کمیٹی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی ڈالیں لیکن مرکزی مجلس شوریٰ میں ان کی پیش نہ گئی اور پہلی جائزہ کمیٹی پر اعتراض کئے گئے تو شوریٰ نے اسے توڑ کر ایک دوسری جائزہ کمیٹی مقرر کر دی — ایک سال کے بعد جب یہ جائزہ کمیٹی اپنی رپورٹ لے کر شوریٰ کے سامنے پیش ہوئی تو اس کے جمع کردہ مواد نے شوریٰ کی ایک فیصلہ کن اکثریت کو اس قطعی نتیجے پر پہنچا دیا کہ جماعت ایک بالکل غلط رُخ پر بڑھ آئی ہے۔ اور اب خیریت اسی میں ہے کہ اس کا رُخ کو تبدیل کر دیا جائے — ! مولانا مودودی اور ان کے ہمخیال لوگوں نے پہلے خود جائزہ کمیٹی پر جرح کرنے کی کوشش کی لیکن جائزہ کمیٹی کے اراکین کی وضاحتوں نے اس حملے کو پسپا کر دیا۔ بدرجہ مجبوری مولانا مودودی نے اپنے استعفے کے ذریعے اظہار ناراضگی کیا لیکن شوریٰ کا تاثر اس قدر گہرا تھا کہ ان کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی — اور جماعت اسلامی کی تاریخ میں غالباً پہلی اور آخری مرتبہ مجلس شوریٰ نے مولانا مودودی کے مقابلے میں اپنے موقف پر اصرار کیا — اب جماعت کے دستور کی رُو سے مولانا مودودی کے سامنے دو ہی راستے کھلے رہ گئے تھے : یا یہ کہ شوریٰ سے مفاہمت کر لیں — اور یا پھر اپنے اور شوریٰ کے نزاع کو لے کر عام ارکان کے سامنے پیش ہوں۔ اس صورت میں مولانا مودودی بحیثیت امیر جماعت

ایک فریق ہونے اور پوری مرکزی شوریٰ فریق ثانی بنتی !—— مولانا مودودی نے پہلی راہ اختیار کی اور ایک مصالحتی فارمولے پر دستخط ثبت کرکے بقول مولانا اصلاحی ہوعاد درود کے بعد شوریٰ سے برخاست ہوگئے،

یہ تو سوائے عالم الغیب والشہادۃ کے کوئی نہیں جانتا کہ مولانا واقعتہً مصالحت پر آمادہ ہو گئے تھے —— یا ان کا یہ اقدام خالص "حکمت عملی" پر مبنی تھا لیکن جو کچھ عالم واقعہ میں ظہور پذیر ہوا وہ یہ تھا کہ ایک طرف ان کے فعال اور کارکن نائبین نے ھنگامہ کھڑا کر دیا اور لاہور، لائلپور اور راولپنڈی کے مقامات پر شوریٰ اور خاص طور پر اس کے 'قدامت پسند' ارکان کے خلاف شورش برپا کر دی، اور دوسری طرف دس دن کے اندر اندر مولانا مودودی کا وہ "الزام نامہ" ارکان جائزہ کمیٹی کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ——— !! جو ہر اعتبار سے صریح ناانصافی اور زیادتی اور سراسر ظلم اور دھاندلی تھا

ظاہر ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علاوہ جماعت میں کسی اور شخص کو یہ مقام حاصل نہ تھا کہ وہ اس موقع پر مولانا مودودی کے ہاتھ کو پکڑ سکتا اور انہیں اس ظلم اور زیادتی سے باز رکھ سکتا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کہ " اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوماً " پر عمل کرتے ہوتے مولانا امین احسن صاحب نے مولانا مودودی کو سمجھانے اور اس ظلم سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی .... لیکن جب انہیں اس میں ناکامی ہوئی تو ان پر سخت مایوسی طاری ہوئی اور مولانا مودودی پر ان کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا ——— اسی مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی کے نام وہ مفصل خط لکھا - جس نے مولانا مودودی کے " الزام نامے " کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ان کی ناانصافی اور دھاندلی کو بالکل عریاں کرکے ان کے سامنے رکھ دیا۔

مولانا اصلاحی نے اپنے اس خط میں اگرچہ جائزہ کمیٹی کے تقرر سے لیکر شوریٰ کے اختتام تک کے تمام واقعات پر مفصل تبصرہ کیا اور مولانا مودودی کے الزام نامے کے ایک ایک لفظ کا پوسٹ مارٹم کیا لیکن ان کا اصل زور دستور اور ضابطے کی پابندی ——— اور جمہوریت اور شورائیت کے نظام کو برقرار رکھنے پر تھا! ——— اور ان کے خط کے اسی مرکزی نقطے کی وضاحت کے لئے اس کے پس منظر کو اس قدر تفصیلاً بیان کرنا ضروری تھا ——— ؟　(مسلسل)

> **تصحیح** 'میثاق' اکتوبر ۶۶ء میں صفحات ۳۹، ۴۰ کاتب کی غلطی سے آگے پیچھے ہوگئے ہیں اس لئے صفحہ ۳۸ کے بعد پہلے ۴۰ پڑھا جائے اور پھر ۳۹　(مدیر)

افکار و آراء

(۱) جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونیوالوں کی خدمت میں

محترم ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔

پہلے تو میں اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کراچی کا ایک چھوٹا سا پرچون کا دکاندار جس کی کل مالیت ایک ہزار اور اوسط آمدنی ۱۵۰ روپے ماہوار ہے۔ جھگی میں رہتا ہوں لیکن میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے آپکو ایک بہت ذمہ دار انسان سمجھتا ہوں میں جماعت اسلامی کے ساتھ ۱۹۵۲ء سے منسلک ہوں۔ اس وقت میں ریاست سوات میں رہتا تھا۔ وہاں بانی جماعت تاج الملوک مرحوم تھے، میں ان کے کردار سے بہت زیادہ متأثر ہوا، اسی دوران میں میں نے رکنیت کے لئے درخواست دی شاید میں رکنیت کا بار اٹھانے کا اہل نہیں تھا۔ اس لئے ایک سال ہونے کے باوجود رکنیت منظور نہیں ہوئی۔ وہاں سے معاشی حالت خراب ہونے کے سبب مجھے کراچی آنا پڑا یہاں سے بھی درخواست دیدی لیکن چند مہینے بعد مارشل لاء نافذ ہوگیا۔ مارشل لاء ختم ہونے کے بعد جماعت کی ہدایت پر میں نے درخواست کی تجدید کی۔ لیکن امیدواری کے دوران میں بھی برابر جماعت کے کارکنوں کی خامیوں پر تنقید کرتا رہا۔ جس کی وجہ سے میری رکنیت التوا میں ہی رہی۔ اب تک مجھ پر صرف جماعت کے کارکنوں کی غلطیاں عیاں ہوتی تھیں جس سے مجھے انتہائی رنج ہوتا تھا۔ لیکن گذشتہ انتخابات میں مجھ پر جماعتی غلطیاں، خصوصاً صدارتی انتخابات میں واضح طور پر عیاں ہوگئیں۔ چنانچہ میں نے جماعت کے موجودہ طریقہ کار پر تنقید شروع کی تاکہ میں مطمئن ہو جاؤں لیکن اطمینان کے بجائے مجھے یہ جواب دیا گیا کہ تم تو منفق ہو اور منفق کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، جماعت تمہیں اطمینان دلانے کی ذمہ دار نہیں ہے۔ تمہیں اگر اتفاق نہیں ہے تو تم خود ہی الگ ہو جاؤ۔ چنانچہ میں جماعت سے الگ ہوگیا۔ لیکن چونکہ مسلمان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اکیلا یہ کام نہیں کرسکتا اور کوئی تحریک بھی نہیں اس لئے کافی خلا محسوس کرتا ہوں اور رات دن یہی سوچتا ہوں کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ آپ لوگ اس بار کو اٹھانے کے قابل ہوتے ہوئے بھی دس سال خاموش رہے۔۔۔۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ جلد سے جلد جماعت سے نکلے ہوئے حضرات کو دعوت دیں کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ کی راہ اختیار کریں۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔

احقر — سالم جان مکان ۱۵۹ نشتر بستی
پیر کالونی — کراچی ۵

[ایڈیٹر میثاق محترم سالم جان صاحب کے ان سادہ لیکن انتہائی مخلصانہ و دردمندانہ جذبات کو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے "بزرگ" اراکین کی خدمت میں پیش کرتا ہے!]

(۲) علمائے کرام کی خدمت میں! —

آپ سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں دین اسلام کے خلاف بے شمار فتنے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ فی زمانہ بھی ایک اہم اور خطرناک فتنہ وہ ہے جس کے ذریعہ دین کو مسخ اور اس میں تحریف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قرآن و سنت اور دین و شریعت کے مطالب و معنی کو مسخ کرنے کی جو کوششیں جدید فتنہ پردازوں کی طرف سے کی جا رہی ہیں۔ الحمد للہ علماء حق کی طرف سے بھی ان کا دندان شکن اور کماحقہٗ جواب دیا جا رہا ہے لیکن اسی قبیل کا ایک فتنہ جس کی طرف بالعموم اردو زبان میں پوری توجہ نہیں دی جا سکی وہ "تاریخ اسلام" کو مسخ کرنے کا فتنہ ہے اگرچہ مولانا عبدالشکور صاحب، مولانا اکبر شاہ خاں، سید انور الحسن شاہ صاحب بخاری، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی اور ترجمان الاسلام جیسے دینی پرچوں میں لکھنے والے حضرات کے ساتھ ساتھ دیگر علماء کرام کی منفرد کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے مخصوص حالات کے پیش نظر مطلق ان کی انفرادی عرق ریزیوں سے فتنہ کا استیصال محال نظر آتا ہے۔

بدقسمتی سے تاریخ اسلام کو ترتیب دینے کے وقت سے ہی یہ علم بیشتر ایسے ہاتھوں میں رہا ہے، جس کا پایہ ثقاہت محدثین کرام فقہائے عظام کے درجہ کا نہیں تھا اور جامعین تاریخ نے بعض مصالح کی بنا پر رطب و یابس کو اپنے مجموعوں میں جمع کر ڈالا ہے نیز تاریخ اسلام کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے محققین روایت میسر نہ آسکے اور یہ ذخیرہ جوں کا توں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ دشمنان اسلام بالخصوص یورپ کے عیسائی مشنریز اور مستشرقین نے اس ذخیرہ سے باطل افسانے لے کر اسلام، پیغمبر اسلام، صحابہ کرام اور صلحائے امت کی سیرتوں کو نعوذ باللہ بزعم خود داغدار بنا کر دنیا کے سامنے باربار رکھنے کی سعی کی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ دوسری طرف اس ذخیرہ تاریخ سے جو درسی و معلوماتی کتب تاریخ ترتیب دی گئی ہیں ان میں بھی کسی قسم کے نقد و امتیاز کو کام میں نہیں لایا گیا ہے اور بالتحقیق وصحت فتنہ انگیز مواد ان کتابوں میں بھی جمع کر دیا گیا ہے۔ آج یہی مواد تاریخ اسلام کے نام سے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا اور عام مطالعہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے جس کا یہ افسوسناک نتیجہ نکل رہا ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل اکابر اسلام کے متعلق سخت قسم کی سوئے ظنی میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے اور اسلاف کے ساتھ نئی نسل کے رشتہ دامن میں برابر اضمحلال پیدا ہو رہا ہے۔

اس تشویشناک صورت حال کو روکنا ضروری اور وقت کی دینی خدمت ہے ادارہ اجل بلغ رحیم آباد خدمت تعلیم و دین کا ہی ایک ادارہ ہے اس نے تاریخ اسلام کے بارے میں اس فروگذاشت کو گہری

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

”تحریک جماعت اسلامی“ پر دو تبصروں کے اقتباسات

✱

جماعت اسلامی ہند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ ”زندگی“ رام پور کے تبصرے کے پہلے اور آخری پیراگراف -

”جناب اسرار احمد صاحب کی یہ کتاب تبصرہ نگار نے بالاستیعاب پڑھی ہے - جماعت اسلامی پاکستان سے باہر آجانے والے ارکان نے اس سے پہلے بھی جماعت اور اس کے سر براہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے- یہ کتاب ان سب تحریروں میں متعدد پہلوؤں سے ممتاز ہے - اس کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ اس میں دس سال پہلے تک کی جماعت اسلامی پاکستان کا ایک مکمل جائزہ سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے - اس کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ فاضل مصنف نے جماعت اسلامی قبل از تقسیم ہند کے موقف کی مکمل تائید کی ہے - تیسرا امتیاز یہ ہے کہ جو زبان انہوں نے استعمال کی ہے اس میں جارحیت کم اور سوقیت بالکل نہیں ہے اور اس کا چوتھا امتیاز یہ ہے کہ مصنف، جماعت اسلامی پاکستان کو پھر اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو تقسیم سے پہلے تھا اور وہ خود اسی نصب العین کے حصول کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں جسے انہوں نے پورے شعور کے ساتھ اختیار کیا تھا - “

”اس کتاب پر اپنا مختصر تبصرہ ختم کرتے ہوئے یہ بات پھر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کو اپنی توجہ اس پر مرکوز نہ کرنی چاہیئے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان پر ”انحراف“ واضح ہو جائے بلکہ ان کو اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کرنی چاہیئے کہ جو لوگ انحراف کو سمجھ کر باہر آ چکے ہیں وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعت بن جائیں اور اعلائے کلمۃاللہ کا وہ کام انجام دیں جس کی محبت میں انہوں نے جماعت اسلامی پاکستان سے قطع تعلق کیا ہے - اگر ڈاکٹر صاحب اس میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہوگا“ -

★

روز نامہ ”پاکستان ٹائمز“ لاہور کے تبصرے کا اول و آخر

"Many books have been written in recent times exposing the ideological and practical aspects of the politics of Jama'at-i-Islami. But the usual complaint about such studies has been that they start with a predisposed antipathy towards the movement, a pre-judgement that does not take into consideration the basic appeal which the philosophy of Maudoodism holds for a large number of sincere, self sacrificing, and honest intellectuals in the country. A diatribe, which instead of analysing, is merely an airing of pre-conceived notions about a potent political tendency, loses its case because of such prejudgements. This is not a work in that category."

"Dr. Asrar Ahmed writes with conviction, and his arguments, based as they are on the self analysis of a partisan (on behalf of the Jama'at), are more forceful than any "objective" analysis carried out by a non-member could have been. If there is any bias in his writing it is in favour of the original aims and objects of this group. That is why this book can be regarded as the finest study of Jama'at-i-Islami apart from its value as a personal record of a disillusioned political worker."

Regd. No. L. 7360.

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 12	NOVEMBER 1966	No. 5

ہم سے طلب فرمائیے

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

★

تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ

بڑا سائز ، صفحات : ۳۶

ہدیہ : ۷۵ پیسے

★

اسلامی قانون کی تدوین

صفحات : ۱۶۰ ، قیمت : ۳ روپے

سستا ایڈیشن : ۲ روپے

★

عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ

صفحات : ۱۲۸ ، قیمت : ۲٫۲۵ روپے

اسباق النحو

تصنیف مولانا حمیدالدین فراہی رح

قیمت : ۱٫۱۵ روپیہ

حصہ دوم

۱٫۰۰ روپیہ

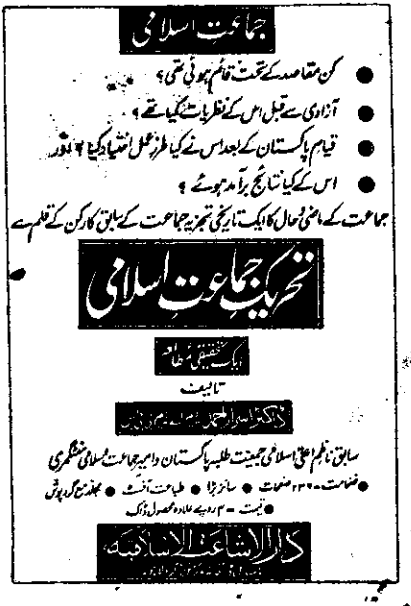

امثال آصف الحکم

تصنیف مولانا حمیدالدین فراہی رح

قیمت : ۱٫۳۷ روپیہ

دار الاشاعت الاسلامیہ

بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر ، لاہور-۱